ماہنامہ محدث بنارس

سرپرست
عبداللہ سعود بن عبدالوحید

مدیر
مولانا عبدالوہاب حجازی

معاون مدیر
مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی — مولانا عبدالمتین مدنی

عدد مسلسل: ۳۳۲
جلد: ۲۹ ، شمارہ: ۸

رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ
اگست ۲۰۱۱ء

بدل اشتراک

- ہندوستان: 150 روپے
- بیرون ممالک: 40 ڈالر
- فی شمارہ: 15 روپے

مراسلت کا پتہ

دار التالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱ جی، ریوڑی تالاب
وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

Darut Taleef Wat Tarjama
B.18/1-G, Reori Talab,
Varanasi - 221010

اس شمارہ میں

۱-درس قرآن	عبداللہ سعود بن عبدالوحید	۲
۲-درس حدیث	مولانا عبدالمتین مدنی	۳
۳-افتتاحیہ	مدیر	۵
۴-ترجمان القرآن.....	مولانا محمد اعظمی	۷
۵-دارالحدیث رحمانیہ دہلی.....	مولانا اسعد اعظمی	۱۱
۶-زکوۃ: مسائل واحکام	ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد	۱۶
۷-چند صفحات شہر مبارک سے متعلق	عبدالاحد احسن جمیل	۲۵
۸-حرم مکی کے بعض مقامات.....	محمد اظہر بن اصغر علی امام مہدی	۳۳
۹-فتنے اوران سے بچنے کے طریقے	حماد عبدالغفار	۳۹
۱۰-بیت المال: ضرورت واہمیت	مستفیض الرحمٰن محمد ریحان	۴۲
۱۱-.....طلباء سے خطاب	مولانا عبدالمتین مدنی	۴۶
۱۲-باب الفتاوی	مولانا نورالہدی سلفی	۴۷

نوٹ: ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

درس قرآن

دعا کا انسان کے عقیدہ سے گہرا تعلق ہے

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ (سورہ غافر:۶۰)

اور تمہارے رب کا یہ فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا، بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے خود سری کرتے ہیں، عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

یہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے جو ہم سب کا خالق، مالک اور رب ہے، اللہ کے رسول محمد ﷺ کا فرمان ہے: "إن الدعاء هو العبادة" (مسند احمد:۱۸۳۷۸) کہ دعا ہی عبادت ہے۔

انسان اپنی مختلف ضروریات اور پریشانیوں میں اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق مختلف طریقوں سے دعا کرتا ہے، جو سچے اور موحد مومن ہوتے ہیں وہ ہر موقع پر صرف اللہ رب العالمین سے ہی دعا کرتے ہیں چاہے خوشی کا مقام ہو یا پریشانی کا، وہ جانتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ وحدہ لاشریک سے ہی لو لگانی چاہئے، یہی اسلام کی تعلیم اور نجات کا راستہ ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یا علی، یا غوث و یا خواجہ کی پکار بھی کرتے ہیں اور اپنی حاجت و پریشانی میں مزارات پر بھی جا کر فریاد رسی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی بنیں گے یا یہاں سے ہماری مراد پوری ہو جائے گی، میں نے اس سے پہلے درس میں لکھا تھا کہ قرآن میں اللہ کا فیصلہ لکھا ہوا ہے کہ رب العالمین سب کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے، ہم چاہے اللہ کو مانیں یا نہ مانیں حقیقت میں وہی ہمارا رب ہے، اور بروز قیامت سب کو اسی کے سامنے پیش ہونا ہے۔

محمد ﷺ جب نبی بنا کر بھیجے گئے اس وقت کفار مکہ کا عقیدہ تھا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پریشانیاں وہی دور کرتا ہے، ان معبودوں کی عبادت سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ان کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرتے ہیں اور یہ ہماری باتوں کو اللہ تک پہنچاتے ہیں جیسا کہ سورہ زمر کی آیت نمبر تین میں مذکور ہے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ ہم ان کی عبادت تو صرف اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کے باوجود ان کو کافر و مشرک کے لفظ سے پکارا گیا۔

دعا کو نبی کریم ﷺ نے عبادت میں شمار کیا ہے اور اس دعا کا انسان کے عقیدہ سے گہرا تعلق ہے جس کا جو عقیدہ ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ دعا کرتا ہے، شیطان چاہتا ہے کہ سب کو گمراہی کے راستہ میں ڈھکیل دے تاکہ کوئی جنت کا مستحق نہ بن سکے، جیسا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرکے اللہ کی پھٹکار کا موجب بنا اور ابن آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اللہ سے مہلت مانگی تھی۔

اللہ تعالی نے اپنے اس فرمان میں یہ بھی فرمایا ہے کہ جو ہم کو نہیں پکارتے اور ہماری عبادت سے خودسری کرتے ہیں ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم ان کو جہنم میں داخل کریں گے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہم کو موحد اور سچا مومن بنا اور دعا و مناجات کے وقت ایسے الفاظ اور وسیلہ سے بچا جو ہم کو جہنم میں لے جانے والا ہو، تو ہی ہمارا رب ہے اور ہم تیرے بندے ہیں، تو ہماری سن لے، آمین۔

☆☆☆

درس حدیث

يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ أَقْبِلْ

مولانا عبدالمتین مدنی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ فُتِّحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ وَصُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُ وَمُسْلِمٌ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ فُتِّحَتْ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ (خ ٤ / ١١٢ م ١٠٧٩)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جب رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری وامام مسلم نے روایت کیا ہے اور امام مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

سید الشہور رمضان المبارک متعدد فضائل وخصائص کا حامل ہے، اسی ماہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا، یہ ماہ رحمت ومغفرت اور صبر ومساوات کا مہینہ ہے، اسی ماہ میں بدر وفتح مکہ کے عظیم واقعات پیش آئے، قدر کی رات اور اعتکاف کی سنت بھی رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہے، اس ماہ مبارک کی ہر رات اللہ کے بندوں کو جہنم سے آزادی کا پروانہ ملتا ہے، رمضان کی راتوں کا قیام، تہجد دوسری راتوں کی عبادت سے افضل ہے، یہ ماہ تلاوت قرآن، ذکر واذکار اور توبہ واستغفار کا ہے، اللہ کے بندے بوقت سحر استغفار کرتے ہیں، اور روزہ دار کی دعائیں بوقت افطار رد نہیں کی جاتیں، یہ ماہ تقوی اور خدمت خلق کی تربیت کا مہینہ ہے۔ الغرض یہ کہ اس ماہ کے فضائل اور امتیازات بکثرت ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث شریف میں بھی اس ماہ کی تین خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں اور اسی کی ہم معنی روایت سنن ترمذی وابن ماجہ میں بھی ہے جس میں مزید وضاحت ہے۔

"اِذَا كَانَ أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنَّةِ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ أَقْبِلْ وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ كُلُّ لَيْلَةٍ "۔ (ت ۳۵۹/۳ جہ: ۱۶۴۲، ابن خزیمہ ۱۸۸/۳، واسنادہ حسن)

جب ماہ رمضان کی پہلی شب ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن قید کردیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، اس کا کوئی بھی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اس کا کوئی بھی دروازہ

بند نہیں رہتا اور ایک ندا لگانے والا ندا لگاتا ہے: اے خیر کے شائق پیش قدمی کرو اور اے شر کے شائق باز آ جاؤ، اور ہر رات اللہ کی طرف سے جہنم سے آزادی حاصل کرنے والے ہوتے ہیں، اس عظیم رات میں اللہ کے بندوں کے لیے بڑی بشارتیں ہیں، رمضان کے آغاز ہی سے جنت کے تمام دروازوں کا وا ہونا اور جہنم کے تمام دروازوں کا بند ہونا، اللہ کے بندوں کو پیغام دیتا ہے اب جنت کے دروازے آپ کے لیے کھول دیئے گئے، آپ کو اس ماہ مبارک میں نیکیوں کے بڑے مواقع فراہم کردیئے گئے اور نیکیوں کا کام کرنا بھی آپ کے لیے آسان کردیا گیا، اس لیے کہ بڑے اور سرکش شیاطین مقید ہیں، اب ان کے پاس گمراہ کرنے اور بہکانے کے اتنے مواقع میسر نہیں جتنے انہیں دوسرے دنوں میں حاصل تھے، اس لیے آؤ پیش قدمی کرو، اللہ کا منادی تمہیں پکار رہا ہے، اللہ کی رحمتیں، اس کی مغفرت اور اس کی جنت جسے ہر شب رمضان میں رب کریم آپ کے لیے سجاتا اور سنوارتا ہے تمہاری منتظر ہے، آؤ نیک آعمال کرکے نمازیں ادا کرکے، روزے رکھ کر، صدقات وخیرات کرکے، فرض زکوۃ نکال کر، صلہ رحمی کرکے، قرآن کریم کی تلاوت اور ذکرواذکار سے اپنی زبان تر کرکے، اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی اور احسان کا سلوک کرکے اپنے آپ کو اللہ کی رحمت ومغفرت کا مستحق بنالو۔

اور اے غافل انسان، گناہوں میں ملوث، معاصی کے رسیا، رب اور اس کی رحمتوں سے بے پرواہ آؤ یہ مہینہ اور اس مہینہ کی رحمتیں آپ کے لیے ہیں، آؤ اپنی اصلاح کرو، گناہوں سے باز آؤ، اپنی زبان اور دل کو پاک وصاف کرلو، غیبت، چغلی، گالی گلوج، حسد، حقد، کینہ اور اس جیسی دوسرے گناہوں سے، ظلم، جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت اور اس جیسے گناہوں کو چھوڑو، شیطان مقید آپ کے لیے کئے گئے، جہنم کے دروازے آپ کے لیے بند کئے گئے، رب کا منادی آپ کو پکار رہا ہے، اب تو اپنے آپ کو سنبھالو، اصلاح کے اتنے مواقع آپ کو حاصل ہیں اور اصلاح کا یہ عمل آپ کے لیے اتنا آسان بنادیا گیا ہے، جب آپ کا پیٹ روزہ رکھ سکتا ہے تو آپ کی زبان، کان، آنکھیں، دل اور دوسرے اعضاء روزہ کیوں نہیں رکھ سکتے، واللہ رکھ سکتے ہیں اور یہی روزہ کا مقصد ہے اور یہی اصل تقوی ہے، اور روزہ کے ذریعہ سے ان اعضاء کی تربیت کرنا مقصود ہے، صرف بھوک وپیاس کا نام روزہ نہیں ہے۔

اس لیے اس ماہ مبارک کی آمد سے فائدہ اٹھاؤ اور اسے اپنی اصلاح کا مہینہ بنالو، ہوسکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا آخری رمضان ہو، جو لوگ کل ہمارے ساتھ تھے ان سے عبرت حاصل کرو، ان کی نمازیں، ان کے روزے، ان کے صدقات وخیرات ان کی قبروں میں ان کے لیے سامان نور رونکہت ہیں اور اسی کی روشنی میں وہ پل صراط کا سفر طے کرتے ہوئے اپنے ابدی مقر جنت میں اللہ کی رحمت سے داخل ہوں گے۔

☆☆☆

افتتاحیہ

رمضان المبارک کے چند امتیازی خصائص

اللہ تعالی نے بندوں پر رحم کرنے اور انہیں دنیا و آخرت میں سعادت مند بنانے کے لیے اپنا پسندیدہ آخری دین دین اسلام دے کر اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، دین اسلام کی بنیاد پانچ اساسی تعلیمات پر قائم ہے (۱) کلمۂ توحید کی گواہی دینا (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوۃ دینا (۴) رمضان کے روزے رکھنا (۵) طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج کرنا۔ ان میں سے ہر ایک کے امتیازی خصائص وفضائل و برکات ہیں، رمضان المبارک کے بھی خصوصی امتیازات وفضائل ہیں جو کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ثابت ہیں۔

(۱) رمضان المبارک کا اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید سے نہایت گہرا تعلق ہے، دیکھئے قرآن مجید کی شہادت ہے: ﴿شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان﴾ (البقرہ: ۱۸۵) رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے، اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کی روشن نشانیاں ہیں، یہ قرآن مجید رمضان المبارک کی شب قدر میں اترا، پہلے لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے بیت العزۃ میں اتارا گیا، پھر وہاں سے ضرورت کے مطابق ہمارے رسول محمد ﷺ پر تیئس سال تک اترتا رہا، اس لیے قرآن کا رمضان میں اترنا، شب قدر میں اترنا یا مبارک رات میں اترنا ایک ہی بات ہوئی، اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿إنا أنزلناه في ليلة القدر﴾ (سورۃ القدر) یقیناً ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں اتارا۔ یہ شب قدر رمضان المبارک میں ہوتی ہے، سورۃ الدخان میں ارشاد ہے: ﴿إنا أنزلناه في ليلة مباركة﴾ (یقیناً ہم نے اس قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے، اس سے مراد شب قدر ہے، اس برکت والی رات میں قرآن اترا، ہمارے نبی کو درجۂ نبوت و رسالت عطا ہوا، اس قرآن اور ہمارے نبی کے ذریعہ اللہ کی رحمت و برکت سارے عالم میں عام ہوگئی، اس رات میں فرشتے اور جبریل زمین پر اترتے ہیں، شب مبارک میں ہر مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس سے متعلق فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے، یہ کام آنے والے سال کے موت وحیات، مسائل زندگی اور روزی کی تنگی و کشادگی وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں، انہیں لوح محفوظ سے اتار کر فرشتوں میں اسی رات کو تقسیم کیا جاتا ہے، اسی رات میں قرآن اتار کر اللہ نے بندوں میں اپنی رحمت و برکت کو تقسیم کرنا چاہا ہے، قرآن کی تعلیمات کی یہ رحمت و برکت عام نہ ہوتی تو روئے زمین درندوں کا بھٹ بن جاتی۔

رمضان المبارک اور قرآن مجید میں کتنا گہرا ربط ہے اس کا اندازہ بخاری و مسلم کی اس متفق علیہ حدیث سے لگائیے، حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سب سے بڑھ کر سخی و فیاض تھے اور رمضان میں حضرت جبریل ؑ آپ ﷺ سے ملتے تو آپ اور زیادہ سخاوت کرتے تھے: وكان جبريل يلقاه في كل ليلة من رمضان فيدارسه القرآن، فالرسول الله ﷺ حين يلقاه جبريل أجود بالخير من الريح المرسلة۔ (متفق علیہ) اور جبریل علیہ

السلام رمضان کی ہر رات کو آپ سے ملاقات کرتے تھے اور آپ ﷺ سے قرآن سننے اور سنانے کا سلسلہ جاری رکھتے، تو جبریل کی آپ سے ملاقات پر آپ ﷺ تیز ہوا سے زیادہ بھلائی میں سخاوت فرماتے تھے، اس حدیث صحیح سے رمضان المبارک اور قرآن مجید کے گہرے ربط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) یہ رمضان المبارک کا امتیازی وصف ہے کہ اس کی آمد پر جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے، اس کے اثرات کا اندازہ سارے عالم کے کروڑوں اہل ایمان کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح نیکیوں کا ایک موسم بہار شروع ہوجاتا ہے، تلاوت قرآن، ذکر و دعا، نوافل و فرائض، تراویح اور جود وسخاوت کے ذریعہ لوگ اللہ کی جانب مائل ہوجاتے ہیں، ایک متفق علیہ حدیث میں ہمارے نبی ﷺ فرماتے ہیں: "إذا جاء رمضان فتحت أبواب الجنة وغلقت أبواب النار، وصفدت الشياطين۔ (متفق علیہ) جب رمضان المبارک آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

(۳) صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث الٰہی میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الصيام لي و أنا أجزي به۔ یعنی روزہ میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ دراصل اہل ایمان سبھی نیکیاں اللہ کے لیے انجام دینے کی سعی کرتے ہیں اور سب نیکیوں کا بدلہ اللہ ہی دے گا، لیکن روزہ کی جو امتیازی خصوصیت اس حدیث قدسی میں بتائی گئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دیگر نیکی کے کاموں دکھاوا کا گذر ہوتا رہتا ہے، چاہے نماز ہو زکوۃ یا کچھ اور، اور نیکی میں دکھاوا آجانے سے وہ نیکی اللہ کے لیے نہیں رہ جاتی بلکہ اس میں شیطان سا جھے دار ہوجاتا ہے، روزہ جس میں انسان دن بھر بھوکا پیاسا اور شہوات سے دور رہتا ہے اس میں ریا کا کیا گذر؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزے میرے لیے ہے، اور نیکیوں کے بدلے دس گنا بلکہ سات سو گنا اور جتنا اللہ چاہے دیتا ہے مگر روزے کے بارے میں فرمایا کہ میں ہی اس کا بدلہ دوں گا یعنی بے حساب دوں گا، اس کے لیے دیگر نیکیوں کی طرح کوئی تعیین نہیں ہے۔

(۴) رمضان المبارک کی ممتاز ترین خصوصیت اس میں شب قدر کا ہونا ہے، جس کے متعلق سورۃ القدر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس کے معنی یہ ہیں کہ: شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یعنی اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے، ہزار مہینے تراسی سال چار مہینے ہوتے ہیں، چند گھنٹوں میں اتنی زیادہ نیکیاں اللہ کا بندوں پر فضل واحسان اور برکت کے دروازے کھول دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ (دہائی) جب آتا تھا تو ہمارے رسول ﷺ اپنے گھر والوں کو بھی بیدار رکھ کر عبادت میں سخت محنت کرتے تھے، اسی عشرہ میں آپ ﷺ اعتکاف بھی فرماتے تھے، احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شب قدر اسی عشرہ کی طاق راتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے، ایک متفق علیہ حدیث میں آپ ﷺ کے متعلق حضرت عائشہ ام المومنین فرماتی ہیں: كان رسول الله ﷺ إذا دخل العشر أحيا الليل و أيقظ أهله وشد المئزر۔ (متفق علیہ) رمضان المبارک کا جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار رکھتے اور (عبادت کے لیے) کمر کس لیتے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بابرکت مہینے کی فصل بہار سے زیادہ سے زیادہ نیکیوں کے گل و لالہ چننے کی توفیق عطا فرمائے۔ ☆

ترجمان القرآن

ازمولانا ابوالکلام آزاد

مولانا محمد اعظمی رمئوناتھ بھنجن

قرآن کریم کے اردو ترجموں، حاشیوں اور تفسیروں کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں چودھویں صدی ہجری مطابق بیسویں صدی عیسوی کی ترجمان القرآن مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی نوعیت کی منفرد اردو تفسیر ہے، جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت ہر ناحیہ سے منفرد تھی اسی طرح قرآن کریم کا ترجمہ وتفسیر بھی ان کی علمی وقلمی خدمات میں منفرد شاہکار ہے، اس کی تالیف وترتیب میں مولانا نے کس قدر سنگلاخ زمینیں اور طویل وادیاں طے کی ہیں اس کو انہیں کی زبان سے سنیے، فرماتے ہیں:

''کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب وروز کے فکر ونظر کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورہ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں، اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں، تفاسیر وکتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے، اس تمام عرصے کی طلب وجستجو کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے''۔

ترجمان القرآن کا مقصد ونوعیت کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اس ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالب قرآن کے فہم وتدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے..... پہلے کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے، اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو، پھر جا بجا نوٹوں کا اضافہ کیا ہے، یہ قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی ومعارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں''۔

اس اقتباس سے ترجمان القرآن اور اس کے مصنف کا تفسیری منہج وموقف سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ یہ کتاب ہر قسم کی منطقیانہ وفلسفیانہ بحث واستدلال، قیل وقال اور منقول ومعقول کی الجھنوں اور باریک بینیوں سے پاک صاف صرف آیات کے نفس مطالب ومقاصد کی ترجمان ہے، فکر ونظر اور مسلک ومذہب بھی صحابہ وسلف صالحین کی طرح سادہ اور غیر وضعی ہے، اسلوب اور طرز بیان، اجتہادی اور احتیاطی ہے، تقلیدی ہے نہ تجدیدی، اس کے قاری کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ قرآن کہنا کیا چاہتا ہے۔

مولانا نے قرآن کی صحت فہم کے اشکال وموانع پر روشنی ڈالتے ہوئے تفسیر بالرائے کو سب سے بڑا مانع قرار دیا ہے،

چنانچہ فرماتے ہیں:

''اشکال وموانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ وسلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں، تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں، تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل وبصیرت سے کام نہ لیا جائے، خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اول سے آخر تک تعقل وتفکر کی دعوت ہے، دراصل تفسیر بالرائے میں ''رائے'' لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ رائے مصطلحۂ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے''۔

اس کے بعد مولانا نے تفسیر بالرائے کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش کی ہیں کہ جیسے مذاہب کلامیہ کے ہر مذہب کے مناظر نے اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالا، یا مذاہب فقہیہ کے مقلدوں نے یہ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھائے، یا صوفیہ کے ایک گروہ نے اپنے موضوعہ عقائد ومباحث پر قرآن کو ڈھالا، یا یہ طریقہ کہ زمانۂ حال کے اصول علم وترقی قرآن سے ثابت کئے جائیں یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے اور نیوٹن یا ڈارون کے فلسفیانہ نظریات کو قرآن کی تفسیر کے طور پر تسلیم کیا جائے، یہ تمام صورتیں ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہیں''۔

اسلوب بیان:

ترجمان القرآن کا اسلوب بیان جو دوسری تفسیروں سے اس کو ممتاز کرتا ہے یہ ہے کہ فقہ کے اہم مسائل کو بھی مسلک سلف کے مطابق اس قدر لطیف انداز میں ڈھال دیا گیا ہے کہ مفہوم قرآن کا حصہ بن جاتے ہیں اور کسی کو اس پر حرف گیری کی گنجائش نہیں ملتی، چنانچہ "الطلاق مرتان فإمساك بمعروف أو تسريح بإحسان" الآیۃ کا ترجمہ، تشریح اور تفسیر ملاحظہ فرمائیں:

''طلاق (جس کے بعد رجوع کیا جا سکتا ہے) دو مرتبہ (کر کے دو مہینوں میں دو طلاقیں) ہیں، پھر اس کے بعد شوہر کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو اچھے طریقے پر روک لینا (یعنی رجوع کر لینا) یا پھر حسن سلوک کے ساتھ الگ کر دینا (یعنی تیسرے مہینے تیسری طلاق دے کر جدا ہو جانا ہے) نوٹ: طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تین مرتبہ، تین مجلسوں میں، اور ایک کے بعد ایک واقع ہوتی ہے، اور وہ حالت جو قطعی طور پر رشتۂ نکاح قطع کر دیتی ہے، تیسری مجلس، تیسرے مہینے اور تیسری طلاق کے بعد وجود میں آتی ہے الخ۔ (ص ۲۸۴)

آیت مذکورہ کا ترجمہ ومعنی کس قدر سادہ وسہل انداز میں بیان کیا ہے کہ آیت کا اصل منشا ومطلب بغیر کسی تکلف اور دقت نظر کے واضح ہو جاتا ہے، ساتھ ہی اس بات پر تنبیہ حاصل ہوتی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا وقوع قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اس کے بعد "فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" الآیۃ کے شارحانہ ترجمہ میں فقہی حلالہ مشروطہ پر کاری ضرب لگائی ہے، ملاحظہ ہو:

''اگر ایسا ہوا کہ ایک شخص نے (دو طلاقوں) کے بعد رجوع نہ کیا اور تیسرے مہینے طلاق دے دی تو پھر (دونوں میں قطعی جدائی ہوگئی) اب شوہر کے لیے وہ عورت جائز نہ ہوگی، جب تک کہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں نہ آجائے، پھر اگر ایسا ہو کہ دوسرا مرد (نکاح کرنے کے بعد خود بخود) طلاق دے دے اور مرد وعورت از سر نو ملنا چاہیں تو ایک دوسرے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، اس میں ان کے لیے کوئی گناہ نہیں۔''

متشابہات اور حروف مقطعات:

آیات متشابہات کے بارے میں مولانا آزاد کا موقف، سلف صالح کے مسلک تفویض سے ہم آہنگ ہے، چنانچہ محکمات اور متشابہات کے بیان میں لکھتے ہیں:

''صفات الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سودمند نہیں ہوسکتیں، بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں، یہاں بجز تفویض کے چارۂ کار نہیں الخ''۔(ص ۱۶۱)

جن سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے بارے میں بھی مفوضین کے مسلک پر چلتے ہوئے ان حروف کے معنی ومطلب سے تعرض کئے بغیر ان کو الگ الگ ادا کرنے پر اکتفا کیا ہے، مثال کے طور پر "الم، ذلك الكتاب لا ريب فيه" کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''الف، لام، میم، یہ الکتاب ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں''۔

لیکن سورہ بقرہ کے اختتام پر استدراک کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''قرآن کی انیس (۱۹) (یہ سہو ہے، انتیس (۲۹) ہونا چاہئے) سورتیں ایسی ہیں جن کی ابتدا میں حروف مقطعات آئے ہیں، منجملہ ان کے سورہ بقرہ ہے، ان حروف کو ان سورتوں کا نام یا عنوان سمجھنا چاہئے جن میں ان کے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تفسیر سورہ فاتحہ:

ترجمان القرآن میں سورہ فاتحہ کی تفسیر انتہائی جامع اور مبسوط ہے، اب تک ایسی نادر تفسیر ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، اس میں علمی نوادرات ومعلومات کا بہترین قیمتی خزانہ بھرا ہوا ہے، بالخصوص ''رب العالمین'' کی تفسیر میں ربوبیت کی تحقیق وتفصیل اپنی مثال آپ ہے۔

ذوالقرنین، سد اور یاجوج ماجوج:

علماء تفسیر نے قرآن کریم کی سورہ کہف کی تفسیر پر خاص توجہ دی ہے، اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس سورہ میں ذو

القرنین، سد، اور یاجوج ماجوج کے تذکرے نے مفسرین، مورخین اور مستشرقین کو بہت زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ہے، یہ تینوں ہمیشہ مختلف ناحیوں سے موضوع بحث رہے ہیں۔

ترجمان القرآن کی دوسری جلد میں ان تینوں سے متعلق بحث وتحقیق تیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، ذوالقرنین کا نام، لقب ونسب، مقام ووطن، صفات وخصوصیات، بادشاہت، طاقت، فتوحات اور دیگر حالات، پھر اس کی تعمیر کردہ دیوار جو سد سکندری سے مشہور ہے، اس کا محل وقوع، اسی کے ساتھ یاجوج وماجوج کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں وغیرہ، یہ تمام باتیں بحث وتحقیق کے بنیادی عناصر ہیں۔

یہ تمام مباحث، قدیم وجدید تاریخی ماخذوں پر مبنی ہیں اور توراتی ومسیحی صحیفوں سے فراہم کردہ معلومات کے ساتھ دو نقشے بھی منسلک ہیں، پہلے نقشہ میں ذوالقرنین کی مغربی، مشرقی اور شمالی فتوحات کی نشان دہی کی گئی ہے، دوسرے نقشہ میں یاجوج ماجوج کے مغربی ایشیا پر حملے اور سد ذوالقرنین کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے۔

ان ساری تحقیقات وتفصیلات کا مرجع وماخذ، قرآن وحدیث یا کوئی مستند تاریخی دستاویز نہیں ہے، اس لیے ان کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی جاسکتی۔

ترجمان القرآن کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ دوجلدوں میں سورۃ المومنون پارہ ۱۸ تک شائع ہوکر نا تمام رہ گئی، دونوں جلدیں مولانا آزاد کی حیات ہی میں دوبارہ شائع ہوئی تھیں، ان کی وفات کے بعد ان کی تمام کتابیں اور مسودے سرکاری تحویل میں چلے جانے سے بہت کم اشاعت کی منزل تک پہنچ سکے، کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوا کہ پاکستان میں مکمل ترجمان القرآن شائع ہوئی ہے، اور ہندوستان میں بھی محدود نسخے تقسیم ہوئے ہیں، بہرحال کہ ترجمان القرآن اور مولانا کی دوسری اسلامی ومذہبی تصانیف سلفی منہج کی حامل ہونے کی وجہ سے تلقی بالقبول کی داد پانے سے محروم رہ گئیں، اس میں اہل علم کی بدذوقی اور علمی پستی کا بھی بہت دخل ہے، جس طرح تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن مرتبہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کا یہ المیہ ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی حیات مبارکہ میں جو ایڈیشن چھاپا تھا وہی اول وآخر رہا۔ (۱) اللہ تعالی ان دونوں مفسروں کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور ان کی تفسیروں کو ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

☆☆☆

(۱) اہل علم کے لیے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ کتاب ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' دارالسلام ریاض سے تخریج وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔ (ادارہ)

مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی

اساتذۂ کرام

مولانا اسعد اعظمی/ استاذ جامعہ سلفیہ

(۵) مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی (۱۹۱۰-۱۹۹۹ء)

مولانا کی تعلیم جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر، جامعہ رحمانیہ بنارس اور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں ہوئی، رحمانیہ دہلی میں آپ نے ساتویں اور آٹھویں جماعتیں پڑھیں اور ۱۹۳۲ء میں فارغ ہوئے، آپ کے اساتذہ میں شیخ الحدیث مولانا احمداللہ پرتاپ گڑھی، تلمیذ رشید علامہ سید نذیر حسین دہلوی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری، مولانا نذیر احمد املوی رحمانی وغیرہم سرفہرست ہیں، آپ خطیب الہند اور خطیب الاسلام کے لقب سے ملقب تھے، متعدد مفید کتابیں تصنیف فرمائیں، اور ایک عرصہ تک درس وتدریس سے بھی منسلک رہے۔

دارالحدیث رحمانیہ سے فراغت کے بعد ذمہ داران مدرسہ نے آپ کی علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے آپ کو مدرسہ میں مدرس مقرر کرلیا، جہاں آپ نے ایک سال تدریسی خدمت انجام دی، مگر کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور آپ مستعفی ہوکر گھر چلے آئے، مولانا اپنی تدریس کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''میری تعلیم وتدریس کا زمانہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے شروع ہوا، میں وہاں سے ۲۲/ برس کی عمر میں فارغ ہوا، اور معابعد ۲۳/ برس کی عمر میں اسی میں مدرس مقرر ہوگیا، اس وقت میری تنخواہ تیس روپئے ماہوار تھی، اس زمانے میں بڑے بڑے علما کی بھی تنخواہ سو روپئے سے زائد نہ تھی، میں نے اس زمانہ میں پانچ گھنٹیاں جماعت خامسہ تک لی تھیں..''۔(۱)

ایک جگہ مولانا رحمانی اپنے درس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں جو درس دیتا تھا مکمل طور پر آنے والے سات دن کے اسباق کا مطالعہ کرلیتا تھا کہ ممکن ہے آگے آنے والی کوئی چیز ایسی ہو جس کا کچھ تعلق ماسبق سے ہو.....''۔(۲)

ایک جگہ فرماتے ہیں:

''میری تدریس کا یہ قاعدہ تھا کہ شرح عقائد کا مطالعہ کرتا اور سات دن تک آگے آنے والے اسباق پر نظر ڈال لیتا اور شرح عقائد کی شرح خیالی کو پڑھتا، پھر ملا افغانی کی شرح رمضان آفندی پڑھتا، اس طرح بسط وتفصیل سے میں سبق پڑھاتا کہ سارے طلبہ مطمئن ہوکر اٹھتے..''۔(۳)

---

(۱) ماہنامہ السراج، جھنڈانگر، مئی-اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص: ۴۱۰۔

(۲) ایضا، ص: ۴۳۴۔ (۳) ایضا، ص: ۴۱۰-۴۱۱۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرے پڑھانے کے زمانے میں مولانا عبدالسلام صاحب درانی کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی جگہ پر سو روپیہ ماہوار کئی ولایتی مولانا یکے بعد دیگرے آئے، ایک ولایتی مولانا آئے طلبہ نے ان کی شکایت کی وہ چلے گئے، دوسرے آئے طلبہ نے نے ان کی بھی شکایت کی حتی کہ تیسری جماعت کے بچوں نے بھی ان کی شکایت کی، کہ کتاب سمجھ میں نہیں آتی ہے، اس لیے حضرت میاں صاحب ناظم جامعہ رحمانیہ کو یہ خیال ہوا کہ تیسری جماعت تک کے طلبہ بڑے بڑے مولانا کی شکایت کرتے ہیں تو عبدالرؤف کیسے پانچویں جماعت کے طلبہ کو پڑھا سکتا ہے، تو انہوں نے بطور خود پنجابی طلبہ کو بلایا اور کہا کہ عبدالرؤف کے یہاں کتاب سمجھ میں آتی ہے؟ تو لڑکوں نے کہا ہاں آتی ہے، پھر بنگالی اور مدراسی طلبہ کو بلایا اور پوچھا کہ عبدالرؤف کے یہاں کتاب سمجھ میں آتی ہے؟ لڑکوں نے جواب دیا کہ خوب اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے، مولانا عبدالجلیل نے کہا کہ مولانا عبدالرؤف کے یہاں کتاب اس طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر چاہوں تو من وعن فوراً بیان کردوں۔ اس واقعہ کو خود مولانا عبدالجلیل صاحب نے آکر مجھ سے بیان کیا، انہوں نے یہ خبر سنا کر میرے دل کو خوش کردیا''۔(۱)

(۶) مولانا ابوعبداللہ، محمد بن یوسف سورتی (۱۳۰۷-۱۳۶۱ھ)

سامرود میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سامرود اور ممبئی میں حاصل کی، ۱۳۲۵ھ میں دہلی آئے اور مدرسہ نذیر حسین دہلوی میں داخلہ لے کر میاں صاحب کے پوتے مولانا عبدالسلام دہلوی سے حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی، آپ نے سورت سے دہلی کا سفر پیدل طے کیا، دہلی میں دیگر اساتذہ مثلاً مولانا محمد بن عبداللہ جونا گڈھی، مولانا شرف الدین محدث دہلوی، مولانا عبد الوہاب ملتانی وغیرہ سے جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی، اس کے بعد حیدرآباد دکن اور رامپور میں بھی تعلیم حاصل کی، آخر میں ندوہ میں بھی پڑھا، دوران تعلیم دہلی پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں ہاتھ سے نقل کرکے اسٹریٹ لائٹ میں کھڑے ہوکر پڑھتے اور پورا دن سڑک کے سایہ دار درختوں کے نیچے مطالعہ میں گزرتا، علم وادب، رجال وانساب وغیرہ میں آپ کا مرتبہ بڑا اونچا تھا، صرف تین ماہ میں قرآن حفظ کیا تھا۔

جامعہ ملیہ سے تدریس کا آغاز کیا، پھر دارالحدیث رحمانیہ دہلی، جامعہ رحمانیہ بنارس، جامعہ علی گڑھ، جامعہ اعظم بلی ماران دہلی، دارالحدیث ممبئی وغیرہ میں وقفہ وقفہ سے تدریسی فریضہ انجام دیا، عالم باعمل اور غیور اہل حدیث تھے۔(۲)

مولانا نے تقریباً نصف سال دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں درس دیا، ادارہ کے ذمہ داران نے آپ کی بے پناہ صلاحیتوں اور علم وعمل دونوں میں آپ کے تفرد وامتیاز کو دیکھ کر مدرس مقرر کیا، مگر افسوس آپ زیادہ دن یہاں نہ رہ سکے اور

(۱) محدث بنارس جون ۱۹۹۹ء، السراج خطیب الاسلام نمبر: ۲۲۹-۲۳۰۔

(۲) موصوف سے متعلق تفصیلات کے لیے درج ذیل مراجع کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے: نزھۃ الخواطر ج ۸، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ: ستمبر ۱۹۴۹ء، مقدمہ کتاب ازھار العرب، طبع جامعہ سلفیہ، ہندو پاک میں عربی ادب، جھود مخلصۃ، تراجم علمائے اہل حدیث وغیرہ۔

مستعفی ہوکر چلے گئے۔

آپ کے ایک تذکرہ نگار مولانا شاکر گیاوی لکھتے ہیں:

''دہلی مدرسہ رحمانیہ میں علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ سے دل برداشتہ ہوکر مولانا محمد سورتی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسی اختیار فرمائی، نہایت طلیق اور طلبہ پر شفیق بزرگ تھے اور انتہائی غیور بھی۔

ان کی خدمت میں خواجہ عبدالحی فاروقی، حافظ اسلم جیراجپوری، مولانا قصوری وغیرہم اکثر استفادہ کے لیے تشریف لاتے تھے..''۔(۱)

مولانا عبدالغفار حسن رحمانی فرماتے ہیں:

''مدرسہ رحمانیہ میں میرے دوسرے استاذ مشہور ادیب اور جید عالم دین اور عربی زبان کے ماہر الشیخ محمد السورتی تھے، عربی ادب کی مشہور کتاب ''ازہارالعرب'' ان ہی کی تالیف کردہ ہے، ان کے پاس ہم نے جامع الترمذی کی دوسری جلد اور صحیح مسلم کا کچھ حصہ اور شرح نخبۃ الفکر کا کچھ حصہ اور عربی زبان وادب کی بعض کتابیں پڑھیں، مگر یہ چھ ماہ بعد ہی ناظم مدرسہ سے اختلافات کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے''۔(۲)

ایک دوسرے مقام پر سورتی صاحب کے بارے میں مولانا مزید تفصیلات یوں بیان کررہے ہیں:

مولانا موصوف رحمانیہ میں آنے سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دینی علوم کے استاذ تھے، حافظہ بڑا قوی تھا، عربی ادب کا ذوق بے پایاں تھا، ہندوستان میں عربی ادب کے لحاظ سے دو نمایاں شخصیتیں گزری ہیں: (۱) مولانا محمد سورتی مرحوم (۲) مولانا عبدالعزیز میمن، جو میرے جد محترم کے شاگرد تھے، مولانا محمد سورتی مرحوم عربی ذوق، عربی ادب کی مہارت کے ساتھ ساتھ عربوں کا سا مزاج بھی رکھتے تھے، نماز باجماعت اور دوسری سنن کا بڑا اہتمام کرتے تھے، بڑے فراخ دل اور فیاض تھے، ان کے تین صاحبزادے تھے، عبداللہ، محمد طاہر، محمد طیب، بڑے عبداللہ تھے، جن کی عمر اس وقت دس گیارہ سال ہوگی، مولانا کی عادت تھی کہ جب بھی فجر کی نماز میں آتے تینوں کو ساتھ لاتے تھے اور خود بڑے اہتمام کے ساتھ صبح کی نماز کی امامت فرماتے، قرآن مجید پڑھنے کا انداز بھی نہایت دل کش اور پرسوز تھا، مولانا کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت سے غافل نہیں رہتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی کہ ان کی اولاد غلط راستے پر نہ جائے، ایک خاص بات کہ وہ پانچوں نمازیں باجماعت ادا کرتے تھے، اور اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے کر آتے تھے، آج کل عام طور پر یہ حال ہے کہ اکثر اہل علم خود تو نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، لیکن اولاد کی دینی تربیت سے غافل ہیں، مولانا کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ انکار منکر کے بارے میں بڑے بے باک تھے، اور اغنیاء اور امراء کے مقابلے میں اہل علم کا بڑا احترام کرتے تھے، ایک

(۱) ماہنامہ محدث بنارس، مئی ۱۹۹۲ء۔

(۲) ماہنامہ صراط مستقیم، برمنگھم: نومبر-دسمبر ۱۹۹۸ء، ص:۱۴۔

مرتبہ کا ذکر ہے کہ شیخ عطاء الرحمٰن صاحب (مہتمم مدرسہ رحمانیہ دہلی) اپنی عادت کے مطابق مدرسہ رحمانیہ کی ڈیوڑھی میں چارپائی پر بیٹھے تھے، اوراس کے ساتھ دوسری چارپائی پر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا محمد سورتی تشریف فرما تھے، مولانا سورتی مرحوم دونوں کے درمیان میں تھے، اس مجلس میں شیخ عطاء الرحمٰن مدرسے کے بارے میں گفتگو کررہے تھے اور یہ دونوں حضرات ان کی گفتگو بڑی توجہ سے سن رہے تھے، شیخ عطاء الرحمٰن کی گفتگو جاری تھی کہ اچانک مولانا مبارکپوری نے مولانا سورتی کو مخاطب کرتے ہوئے کوئی علمی نقطہ بیان کرنا شروع کردیا، تو میں نے دیکھا کہ مولانا سورتی نے فوراً اپنا چہرہ شیخ عطاء الرحمٰن کی طرف سے ہٹا کر مولانا مبارکپوری کی طرف پھیرلیا، اورانہوں نے اس بات کی پرواہ نہ کی کہ ان کا یہ طرز عمل شیخ عطاء الرحمٰن کو ناگوار ہوسکتا ہے، اس لحاظ سے ان کی بے باکی مشہور تھی، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں کسی بڑے سے بڑے مالدار کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، مولانا مرحوم کے بارے میں شیخ عطاء الرحمٰن کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ وہ علم حدیث اور اسماء الرجال کے ماہر ہیں، اس لیے ان کا تقرر بطور شیخ الحدیث کیا گیا تھا، اوران کا مشاہرہ بھی (۱۵۰) روپئے تھا، جو اس زمانہ میں بڑی تنخواہ تھی، اس کے مقابلہ میں مولانا احمداللہ صاحب کا مشاہرہ تقریباً سو (۱۰۰) روپے تھا اور میرے داخلے سے پہلے مولانا غلام یحییٰ کانپوری کا مشاہرہ ۱۲۵ روپئے تھا، باقی دوسرے مدرسین کی تنخواہیں ۶۰ یا ۷۰ روپئے سے زیادہ نہ تھیں، اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کو اس زمانے کے اہل علم نے بتادیا تھا کہ علم حدیث اور معقولات ایسے علوم ہیں جن کے لیے انتہائی فاضل، قابل اور متخصص اساتذہ ہونے چاہئیں، لیکن کسی نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ علم حدیث کے ساتھ ساتھ تفسیر اور عربی ادب میں بھی اونچے درجے کے قابل استاذ رکھنے چاہئیں، مولانا محمد سورتی مرحوم عربی ادب اور اسماء الرجال کے حافظ تھے، اس میں کوئی ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا تھا، لیکن حدیث پڑھانا بڑی بات ہے اور خاص طور پر صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تدریس، ان کتابوں کو وہی پڑھا سکتا ہے جس نے بار بار گہرا مطالعہ کیا ہو، میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کسی نوجوان مدرس کو پہلی بار صحیح بخاری پڑھانے کے لیے دی جائے تو اس کو ایک دو سبق حدیث کے دیئے جائیں، زیادہ اس پر بوجھ نہ ڈالا جائے تاکہ وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو اچھی طرح پڑھا سکے، اور طلبہ کو مطمئن کرسکے، لیکن جو استاذ پندرہ بیس سال سے متواتر پڑھا رہا ہو، خاص طور پر صحیح بخاری، تو اس کو مزید اسباق پڑھانے کے لیے دیئے جائیں یعنی چھ سات اسباق۔

یہاں یہ معاملہ ہوا کہ مولانا محمد سورتی جامعہ ملیہ سے آئے تھے، وہاں کا نصاب بہت ہلکا تھا اور حدیث کی تعلیم کا معیار ابتدائی انداز کا تھا، اب رحمانیہ میں آکر ان کو چار کتابیں دے دی گئیں، یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع ترمذی اور اس کے ساتھ ساتھ شرح نخبۃ الفکر اور ادب کی ایک کتاب ''مقامات حریری''، جہاں تک مقامات حریری کا تعلق تھا تو اس کے طلبہ بڑے خوش تھے کہ ادب پڑھنے میں اب مزہ آرہا ہے، اور چونکہ مولانا سورتی کا تقرر وسط سال میں ہوا تھا، اسی لیے راقم الحروف کی جماعت نے ان کے پاس ترمذی کا اخیر حصہ پڑھا، جس میں فقہی مسائل کم ہیں، اس لیے ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، لیکن جو طلبہ صحیحین پڑھنے والے تھے وہ مطمئن نہ تھے اور اس طرح ایک عجیب سی کش مکش پیدا ہوگئی، ظاہر بات ہے کہ

جو طلبہ صحیحین مولانا احمد اللہ صاحب سے پڑھتے آرہے تھے جو کہ تیس سال سے حدیث پڑھا رہے تھے، ان کے مقابلہ میں مولانا سورتی کی تدریس تسلی بخش نہیں ہوسکتی تھی، افسوس ہے کہ کسی نے مہتمم صاحب کو یہ نہیں بتایا کہ " لکل فن رجال " کے قاعدے کے مطابق مولانا سورتی کو عربی ادب اور زیادہ سے زیادہ کسی تفسیر کی تدریس کے لیے خاص کرلیا جائے اور اگر کوئی حدیث کی کتاب دی جائے تو صحیحین کے علاوہ صرف ایک کتاب ان کے سپرد کی جائے لیکن افسوس! کہ ایسا نہ ہوسکا۔

مولانا سورتی مرحوم نے اپنے تقرر کے بعد کتب خانے سے صحیحین کی تمام شروح مستعار حاصل کرلیں، لیکن ظاہر ہے کہ بڑی عمر میں ان شروح کا مطالعہ کرنا اور اس کے لیے کافی وقت نکالنا مشکل تھا۔

مولانا سورتی مرحوم عربوں کی طرح فیاضی میں بے مثال تھے، اسی لیے جو استاذ یا شاگرد ان کے پاس جاتا تو وہ اس کی خوب آؤ بھگت کرتے، جب ہماری جماعت نے جامع ترمذی ختم کی اور سب سے پہلے یہ موقع ہم ہی کو ملا کہ مولانا موصوف نے ہم سب طلبہ کی ترمذی ختم ہونے کی خوشی میں شاندار دعوت کی اور سب کچھ اپنے پاس سے خرچ کیا، اس سے پہلے جب کوئی حدیث یا تفسیر کی کتاب ختم ہوتی تو طلبہ چندہ جمع کرکے ضیافت کا اہتمام کرتے تھے، اساتذہ کی مالی شرکت اس میں نہیں ہوتی تھی، الا یہ کہ کوئی استاذ خود ہی اپنا حصہ ڈال دے، لیکن مولانا سورتی مرحوم نے ایک نئی سنت کی بنیاد ڈال دی، ساری ضیافت کا خرچ اپنے ذمہ لے لیا، اور طلبہ پر کچھ بھی بوجھ نہ ڈالا، اس کے نتیجہ میں دوسرے مدرسین کے ساتھ تنافس کی شکل پیدا ہوگئی، اس کش مکش میں یہ سال ختم ہوا اور مولانا محمد سورتی مرحوم کو جواب دے دیا گیا جس سے ان طلبہ کو بڑا افسوس اور صدمہ ہوا جو حدیث کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے بھی شائق تھے، ہمارے درس نظامی میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ معقولات پر تو بہت زور دیا جاتا ہے لیکن تفسیر، ادب، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور جدید مفید علوم کے بارے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا، بہرحال سال کے آخری حصے میں طلبہ کی شکایت پر مہتمم صاحب نے صحیحین کے اسباق دوبارہ مولانا احمد اللہ صاحب کے حوالے کردیئے اور اس طرح یہ قضیہ نامرضیہ ظاہری طور پر ختم ہوا۔

مولانا مرحوم کی عربی زبان دانی کا ایک واقعہ یہ سننے میں آیا ہے کہ جب وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے حرم میں عربی زبان میں فصیح و بلیغ انداز میں توحید پر تقریریں کیں، لوگ حیران تھے کہ کس ملک کا انسان ہے کہ اتنی اچھی عربی بول رہا ہے، ایک مرتبہ تقریر کے بعد ایک عرب عالم نے ان سے دریافت کیا:

أنت من اليمن أو من الحجاز أو من أي بلد أنت؟

یعنی آپ کا مسکن کہاں ہے؟ آپ یمنی ہیں یا حجازی ہیں؟ یا کوئی دوسرا علاقہ ہے آپ کا؟ (۱)

☆☆☆

(۱) الاعتصام لاہور: ۲۸/ اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص: ۱۴-۱۶۔

زکوۃ: مسائل واحکام

ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد/کویت

ارکان ارسلام میں سے ایک اہم رکن زکوۃ ہے جس کے ذریعہ معاشرہ کے پسماندہ طبقہ کی کفالت ہوتی ہے، زکوۃ کے احکام ومسائل سے متعلق یہ وقیع تحریر فاضل قلمکار ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد صاحب کی ہے، رمضان المبارک کی مناسبت سے یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔(ادارہ)

زکاۃ کی تعریف

عربی زبان میں لفظ ''زکاۃ'' پاکیزگی، بڑھوتری اور برکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ شریعت میں ''زکاۃ'' ایک مخصوص مال کے مخصوص حصے کو کہا جاتا ہے، جو مخصوص لوگوں کو دیا جاتا ہے، اور اسے ''زکاۃ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے دینے والے کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اس کا مال پاک اور بابرکت ہوجاتا ہے۔

یاد رہے کہ ''زکاۃ'' کے لیے قرآن وسنت میں ''صدقہ'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

(اے پیغمبر) آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے جس کے ذریعہ آپ ان کو پاک صاف کردیں گے۔

زکاۃ کی اہمیت:

(۱) زکاۃ دین اسلام کے ان پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے جن پر دین اسلام قائم ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "بني الإسلام على خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة ..... الخ" (متفق علیہ)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا اور زکاۃ ادا کرنا.....''۔

(۲) زکاۃ اللہ تعالی کی رحمت کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿ورحمتي وسعت كل شيء فسأكتبها للذين يتقون ويؤتون الزكاة .....﴾ (الأعراف:۱۶۵)

اور میری رحمت تو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، پس میں اپنی رحمت ان لوگوں کے نام لکھ دوں گا جو (گناہ اور شرک سے

بچے رہتے ہیں اور زکاۃ ادا کرتے ہیں۔

(۳) زکاۃ دینی بھائی چارے کی شروط میں سے ایک شرط ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿فإن تابوا و أقاموا الصلاة و آتوا الزكاة فإخوانكم في الدين﴾ (التوبۃ:۱۱)

پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہوجائیں اور زکاۃ دیتے رہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

(۴) مسلم معاشرے میں جن عادات کو عام ہونا چاہئے ان میں سے ایک زکاۃ ہے۔

فرمان الٰہی: ﴿والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة ..... الخ﴾ (التوبۃ:۷۱)

مومن مرد وعورت آپس میں ایک دوسرے کے (مددگار ومعاون اور) دوست ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نمازوں کو پابندی سے بجالاتے اور زکاۃ ادا کرتے ہیں۔

(۵) جنت الفردوس کے وارث بننے والے مومنوں کی جو صفات اللہ نے بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک زکاۃ ادا کرنا ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿والذين هم للزكاة فاعلون﴾ (المومنون:۴)

اور جو زکاۃ ادا کرنے والے ہیں۔

(۶) حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: مجھے ایسا عمل بتائیے جسے کرنے سے میں جنت میں چلا جاؤں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"تعبد الله ولا تشرك به شيئا، وتقيم الصلاة المكتوبة، وتؤتي الزكاة، وتصل الرحم" (متفق علیہ)

اللہ ہی کی عبادت کرتے رہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت بناؤ: فرض نماز پابندی سے ادا کرتے رہو، زکاۃ ادا کرتے رہو، اور صلہ رحمی کرتے رہو۔

(۷) زکاۃ کی ادائیگی سے مال بڑھتا اور بابرکت ہوجاتا ہے اور آفتوں سے محفوظ ہوجاتا ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿وما آتيتم من ربا ليربو في أموال الناس فلا يربو عند الله وما آتيتم من زكاة تريدون وجه الله فأولئك هم المضعفون﴾ (الروم:۳۹)

اور جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہوتا رہے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو تم زکاۃ دوگے اللہ کی خوشنودی پانے کی خاطر تو ایسے لوگ ہی کئی گنا زیادہ پانے والے ہیں۔

زکاۃ کے فوائد:

(۱) اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، جسے چاہے زیادہ دے اور جسے چاہے تھوڑا دے، لیکن

مالداروں کو اللہ تعالی نے زکاۃ دینے، صدقہ کرنے اور خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ جسے اللہ نے تھوڑا دیا ہے اسے بغیر سوال کے ملتا رہے اور اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں، اور فقیر کو اللہ تعالی نے سوال نہ کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ اس کے اندر صبر وشکر جیسی صفات حمیدہ پیدا ہوں، اس طرح معاشرے کے یہ دونوں فرد اللہ کے اجر وثواب کے مستحق ہوتے ہیں، مالدار خرچ کرکے اور فقیر صبر وشکر کرکے۔

(۲) اسلام کے مالیاتی نظام کی ایک خوبی یہ ہے کہ اگر پورے اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے تو دولت چند لوگوں کے ہاتھوں میں منحصر ہونے کی بجائے معاشرے کے تمام افراد میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دیگر مالیاتی نظاموں میں یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے چند افراد تو عیش وعشرت سے زندگی بسر کرتے ہیں اور انہی کے قرب وجوار میں رہنے والے دوسرے لوگ غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں جو بہت بڑا ظلم ہے، چنانچہ معاشرے میں مالیاتی توازن برقرار رکھنے اور اس معاشرتی ظلم کا سد باب کرنے کے لیے اللہ تعالی نے زکاۃ کو فرض کیا اور صدقات اور انفاق کی طرف ترغیب دلائی تاکہ معاشرے کے تمام افراد مال ودولت سے مستفید ہوتے رہیں۔

(۳) زکاۃ کی ادائیگی سے مالدار اور فقیر کے درمیان محبت پیدا ہوتی ہے اور یوں معاشرہ بغض، نفرت اور خودغرضی جیسی بیماریوں سے پاک ہوجاتا ہے، زکاۃ دینے والے میں سخاوت، شفقت اور ہمدردی اور زکاۃ لینے والے میں احسان مندی، تواضع اور انکساری جیسی صفات حمیدہ پیدا ہوجاتی ہیں، گویا نظام زکاۃ معاشرے میں اخلاقی قدروں کو پروان چڑھاتا ہے۔

(۴) تاریخ شاہد ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں جب زکاۃ کو حکومتی سطح پر جمع اور اسے فقراء میں تقسیم کیا جاتا تھا تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب تلاش کرنے کے باوجود بھی معاشرے میں فقراء نہیں ملتے تھے، چنانچہ زکاۃ بیت المال میں جمع کرادی جاتی تھی اور پھر اسے مسلمانوں کے مفادات عامہ میں خرچ کردیا جاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسلامی نظام زکاۃ سے معاشرے میں غربت ختم ہوتی ہے بشرطیکہ اسے پورے اخلاص اور مکمل دیانتداری کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

(۵) مالدار لوگ اگر زکاۃ ادا نہ کریں تو معاشرے میں موجود فقراء احساس کمتری کا شکار ہوجائیں اور ان کے دلوں میں مالداروں کے خلاف شدید عداوت پیدا ہوجائے، اور پھر وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چوری اور ڈاکہ زنی جیسے جرائم کا ارتکاب شروع کردیں۔ یوں معاشرہ بدامنی اور لاقانونیت کی بھیانک تصویر بن جائے، گویا اسلامی نظام زکواۃ ان اخلاقی جرائم کا سد باب کرتا اور معاشرے کو امن وسکون کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

(۶) مال اللہ تعالی کی نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، اور اس کی واحد شکل یہ ہے کہ اس کی زکاۃ ادا کی جائے، اور یہ بات معلوم ہے کہ جب اللہ کی نعمتوں پر شکریہ ادا کیا جائے تو اللہ کی عنایات میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

فرمان الٰہی ہے: ﴿لئن شكرتم لأزيدنكم﴾ (ابراہیم: ۷)

اگر تم شکر ادا کروگے تو میں ضرور بالضرور تمہیں اور زیادہ دوں گا۔

زکاۃ نہ دینے والے کا انجام:

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ زکاۃ فرض ہے اور اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے، چنانچہ جو شخص اس کی فرضیت سے انکار کرے وہ یقیناً کافر اور واجب القتل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد جن لوگوں نے زکاۃ دینے سے انکار کر دیا تھا آپ نے ان کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

" والله لو منعونی عقالا كانوا يؤدونه إلى رسول الله ﷺ لقاتلتهم على منعه".

اللہ کی قسم! جو لوگ ایک رسی بھی آنحضرت ﷺ کو دیا کرتے تھے، اگر مجھے نہیں دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ (البخاری: ۷۲۸۴، ۷۲۸۵، مسلم: ۲۰)

اور جو شخص زکاۃ کی فرضیت کا تو قائل ہو لیکن اسے ادا نہ کرتا ہو تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے متعلق ایک آیت اور ایک حدیث سماعت فرمائیے:

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب أليم، يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لأنفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون﴾ (التوبۃ: ۳۴-۳۵)

اور جو لوگ سونا چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے، جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے تا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا: یہ ہے جسے تم نے اپنے لیے خزانہ بنا رکھا تھا، پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "من آتاه الله مالا فلم يؤد زكاته مثل له يوم القيامة شجاعا أقرع له زبيبتان، يطوقه يوم القيامة، يأخذ بلهزميته يعنى بشدقه، ثم يقول: أنا مالك، أنا كنزك" (البخاری: ۱۴۰۳)

اللہ نے جس کو مال سے نوازا، پھر اس نے زکاۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کا مال گنجے سانپ کی شکل میں آئے گا جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے ہوں گے، یہ سانپ ان کے گلے کا طوق ہوگا اور اس کے جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا، میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔

کن چیزوں میں زکاۃ فرض ہے؟

اسلام میں جن چیزوں پر زکاۃ فرض ہے وہ ان کے متعلقہ کچھ مسائل کچھ اس طرح ہیں:

(۱) سونا/چاندی اور نقدی پیسے

سونا/چاندی میں زکاۃ فرض ہے، بشرطیکہ ان کی مقدار مقررہ نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور اس کی ملکیت پر

ایک سال گذر چکا ہو، سونے کا نصاب ۸۵ گرام جبکہ چاندی کا نصاب ۵۹۵ گرام ہے، اس طرح اگر سونا ۸۵ گرام سے اور چاندی ۵۹۵ گرام سے کم ہو تو زکاۃ فرض نہیں ہوگی، اور اگر یہ دونوں اپنے مقررہ وزن کے برابر یا اس سے زیادہ ہوں لیکن ان پر سال نہ گذرا ہو تو تب بھی زکاۃ فرض نہیں ہوگی۔ دونوں شرطیں اگر موجود ہوں تو سونے چاندی کی زکاۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ان کا وزن دیکھ لیں، پھر مارکیٹ کے موجودہ ریٹ کے مطابق اس وزن کی قیمت کی تحدید کرلیں، اس کے بعد اس کا اڑھائی فیصد یا چالیسواں حصہ زکاۃ کی نیت سے ادا کردیں۔

مسئلہ (۱): سونا/چاندی چاہے ڈھیلے کی شکل میں ہو یا زیورات کی شکل میں دونوں صورتوں میں زکاۃ فرض ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت اپنی بیٹی کو لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے، آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم ان کی زکاۃ دیتی ہو؟'' اس نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"أيسرك أن يسورك الله بهما يوم القيامة سوارين من نار".

کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالی تمہیں ان دونوں کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟ تو اس نے انہیں زمین پر پھینک دیا اور کہا: یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہیں۔ (ابوداود: ۱۵۶۳، والنسائی: ۲۴۷۹، وصححہ الالبانی)

مسئلہ (۲) کاغذی کرنسی چاہے ریال ہو یا دینار، روپیہ ہو یا ڈالر..... وہ بھی سونے چاندی کے حکم میں آتی ہے، لہذا جس شخص کے پاس چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ کرنسی موجود ہو اور اس پر سال گذر چکا ہو تو اس میں زکاۃ فرض ہوگی۔

مسئلہ (۳): قرض کی زکاۃ کی دو صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ مقروض قرضہ تسلیم کرتا ہو اور اسے جلد یا بدیر واپس کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو، یا مقروض تو قرضے سے انکاری ہو لیکن عدالت میں کیس کرکے اس سے قرضہ واپس لینے کا یقین ہو تو اس صورت میں قرض کی رقم کی زکاۃ قرض خواہ کو ادا کرنی ہوگی، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ سال کے اختتام پر جب موجودہ مال کا حساب کیا جارہا ہو اس کے ساتھ قرض کی رقم کو بھی ملا لیا جائے اور ٹوٹل مبلغ کا اڑھائی فیصد بطور زکاۃ ادا کردیا جائے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ مقروض قرضے سے انکاری ہو اور عدالت کے ذریعے اسے واپس لینے کا امکان بھی نہ ہو، یا وہ قرضے کو تسلیم تو کرتا ہو، لیکن ہر آئے دن واپسی کا وعدہ کرکے وعدہ خلافی کرتا ہو، یا اس کے حالات ہی ایسے ہوں کہ وہ قرضہ واپس کرنے کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں قرض کی رقم پر زکاۃ فرض نہیں ہوگی، ہاں جب مقروض قرضہ واپس کردے تو گذشتہ ایک سال کی زکاۃ ادا کردی جائے۔

مسئلہ (۴): ایک شخص کے پاس زکاۃ کا نصاب تو موجود ہو، چاہے سونا/چاندی کی شکل میں یا نقدی کرنسی کی شکل میں یا

کسی اور شکل میں، لیکن وہ خود دوسروں کا مقروض ہو، اور اگر زکاۃ ادا کرے تو مزید بوجھ تلے دب جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت ڈمیں اس پر زکاۃ فرض نہیں ہوگی، ہاں اگر قرض کی ادائیگی کے بعد بھی اس کے پاس زکاۃ کے نصاب کے برابر مال موجود ہو اور اس پر سال گذر چکا ہو تو اس کا اڑھائی فیصد زکاۃ کی نیت سے ادا کرنا ضروری ہوگا۔

مسئلہ (۵): کمپنی کی حصص (شیئرز) اگر تجارتی مقصد سے خریدے گئے ہوں اور ان پر سال گذر چکا ہو تو ان کی زکاۃ ادا کرنا لازمی ہوگا۔ اگر خود کمپنی تمام پارٹنرز کے حصص کی زکاۃ ادا کر دیتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہر پارٹنر اپنے اپنے حصص کی زکاۃ ادا کرنے کا پابند ہوگا۔

مسئلہ (۶): زکاۃ خاص سونے رچاندی پر فرض ہوتی ہے، لہذا ملاوٹ کو وزن میں شمار نہیں کیا جائے گا، اس طرح اگر ملاوٹ کا وزن نکال کر خالص سونے رچاندی کا وزن مقررہ نصاب سے کم ہو جائے تو اس پر زکاۃ فرض نہیں ہوگی۔

(۲) تجارتی سامان:

دوسری چیز جس پر زکاۃ فرض ہوتی ہے وہ ہے ''تجارتی سامان''۔ اور اس سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جنہیں تجارت کی نیت سے خریدا جائے، چاہے مقامی مارکیٹ سے یا باہر سے درآمد کر کے، اس طرح وہ تمام چیزیں اس حکم سے نکل جاتی ہیں جنہیں کسی نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے خریدا ہو، مثلاً گھر، گاڑیاورز مین وغیرہ تو ایسی اشیاء پر زکاۃ فرض نہیں۔ اور اسی طرح صنعتی مشینری، آلات، سٹوز اور ان میں پڑی الماریاں، دفاتر اور ان کے لوازمات پر بھی زکاۃ فرض نہیں کیونکہ ایسی تمام اشیاء ایک جگہ برقرار رہتی ہیں اور انہیں بیچ کر تجارت کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

تجارتی سامان کی زکاۃ نکالنے کا طریقہ:

سال کے اختتام پر تاجر (چاہے فرد ہو یا کمپنی) کو چاہئے کہ وہ اپنے تمام تجارتی سامان کی مارکیٹ کے موجودہ ریٹ کے مطابق قیمت لگائے، پھر اس کے پاس سال بھر جو نقدی کرنسی رہی ہو اسے اس میں شامل کر لے۔ اسی طرح اس کا جو قرضہ قابل واپسی ہو اسے بھی حساب میں شامل کر لے، اور اگر وہ خود مقروض ہو تو قرضے کی رقم نکال کر باقی تمام رقم کا اڑھائی فیصد یا چالیسواں حصہ بطور زکاۃ ادا کر دے۔

مسئلہ: صنعتی آلات اور مشینری کی اصل قیمت پر تو زکاۃ فرض نہیں، البتہ ان کی آمدنی اگر زکاۃ کے نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال بھی گذر جائے تو اس سے زکاۃ نکالنا ضروری ہوگا۔ اور یہی حکم کرائے پر دیئے ہوئے مکانوں، دوکانوں اور گاڑیوں وغیرہ کا بھی ہے کہ ان کی اصل قیمت پر زکاۃ نہیں، کرائے پر ہے بشرطیکہ کرایہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال بھی گذر جائے تو اس کا اڑھائی فیصد ادا کرنا ہوگا، البتہ ان اشیاء پر ادا کیا جانے والا ٹیکس اور ان کی دیکھ بھال پر آنے والے دیگر اخراجات ان چیزوں کی آمدنی سے نکال لئے جائیں۔ اسی طرح اگر مالک کا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں تو وہ اپنے بیوی بچوں کے جائز اخراجات بھی آمدنی سے نکال لے، پھر جو رقم باقی ہو اس سے زکاۃ ادا کر دے۔

(۳) حیوانات:

جن مویشیوں پر زکاۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: اونٹ: گائے رجھینس اور بھیڑ بکریاں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "ما من رجل تكون له إبل أو بقر أو غنم لا يؤدي حقها إلا أتى بها يوم القيامة أعظم ما تكون وأسمنه، تطوه بأخفافها وتنطحه بقرونها، كلما جازت أخراها ردت عليه أولاها حتى يقضى بين الناس"۔ (البخاری:۱۴۶۰)

جس شخص کے پاس اونٹ یا گائے یا بکریاں ہوں اور اس نے ان کی زکاۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن انہیں بڑا اور بہت موٹا کر کے لایا جائے گا، پھر وہ اسے اپنے ٹاپوں سے روندیں گے اور اپنے سینگوں سے ماریں گے، جب سب اس کے اوپر سے گذر جائیں گے تو پہلے کو پھر لوٹایا جائے گا اور لوگوں کا فیصلہ ہونے تک اس کے ساتھ اسی طرح ہوتا رہے گا۔

مویشیوں میں زکاۃ کی فرضیت کے لیے چار شرطیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنے مقررہ نصاب کو پہنچ جائیں، اونٹوں کا کم از کم نصاب پانچ، گائے رجھینس کا تیس اور بھیڑ بکریوں کا چالیس ہے۔ دوسری شرط یہ کہ ان کی ملکیت پر سال گذر جائے۔ تیسری یہ کہ سال کا اکثر حصہ یہ مویشی چرتے رہے ہوں اور مالک کو سال بھر یا سال کا بیشتر حصہ ان کی خوراک خریدنا نہ پڑی ہو۔ اور چوتھی شرط یہ کہ یہ جانور کھیتی باڑی یا بوجھ برداری کے لیے نہ ہوں۔ یہاں یہ بات مدنظر رہنی چاہئے کہ مویشیوں کو اگر تجارت کی نیت سے خریدا گیا ہو تو ان کی زکاۃ دوسرے سامان تجارت کی زکاۃ کی طرح نکالی جائے گی، چنانچہ ان کی قیمت کا اعتبار نہ کہ تعداد کا۔

تنبیہ: مویشیوں کے نصاب کی دیگر تفاصیل حدیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۴) زرعی پیداوار

فرمان الٰہی ہے: ﴿يأيها الذين آمنوا أنفقوا من طيبات ما كسبتم ومما أخرجنا لكم من الأرض﴾ (البقرۃ:۲۶۷)

اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اور ہم نے تمہارے لیے زمین سے جن چیزوں کو نکالا ہے ان میں سے خرچ کرو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ زمینی پیداوار مثلاً گیہوں، جو، چاول، کھجور، انگور اور زیتون وغیرہ میں زکاۃ فرض ہے اور اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے۔

زرعی پیداوار کا نصاب زکاۃ:

فرمان رسول ﷺ ہے: "ليس فيما دون خمسة أوسق صدقة"۔

پانچ وسق سے کم میں زکاۃ نہیں۔ (البخاری:۱۴۰۵، مسلم:۹۷۹)

پانچ وسق کی مقدار موجودہ حساب کے اعتبار سے ۶۵۳ کیلوگرام بنتی ہے، اس طرح زرعی پیداوار اگر اس وزن سے کم ہوتو اس میں زکاۃ فرض نہیں ہوگی، بعض علماء نے اس کا وزن ۶۳۰ کیلوگرام لکھا ہے۔

زرعی پیداوار کا کتنا حصہ زکاۃ میں دیا جائے؟

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا: العشر، وما سقى بالنضح: نصف العشر"۔ (البخاری:۱۴۸۳)

جس کو بارش اور چشموں کے پانی نے سیراب کیا ہو یا وہ خود بخود زمینی پانی سے سیراب ہوا ہو اس میں دسواں حصہ ہے، اور جس کو آلات کے ذریعہ یا محنت کر کے سیراب کیا گیا ہو اس میں بیسواں حصہ ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو پیداوار بارشی پانی یا نہری پانی یا چشموں کے پانی سے حاصل ہوئی ہو اس کا دسواں حصہ اور جسے مشینوں کے ذریعہ سیراب کر کے حاصل کیا گیا ہو اس کا بیسواں حصہ بطور زکاۃ ادا کرنا ہوگا۔

مسئلہ(۱): زرعی پیداوار پر سال گذرنا ضروری نہیں بلکہ وہ جیسے ہی حاصل ہوگی اس کی زکاۃ فوراً ادا کرنی ہوگی، فرمان الٰہی ہے:

﴿وآتوا حقه يوم حصاده﴾ (الانعام:۱۴۱)

اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کردو۔

مسئلہ(۲): تازہ استعمال ہونے والے پھلوں اور سبزیوں پر زکاۃ نہیں ہے الا یہ کہ ان کی تجارت کی جائے، تجارت کی صورت میں اگر ان کی قیمت نصاب زکاۃ کو پہنچ جائے اور وہ سال بھر اس کے پاس رہے تو اس کا اڑھائی فیصد ادا کرنا ہوگا۔

مصارف زکاۃ

زکاۃ کے مسائل میں یہ بھی جان لیجئے کہ مصارف زکاۃ کیا ہیں یعنی کون لوگ زکاۃ لینے کے مستحق ہیں؟

اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله﴾ (التوبۃ:۶۰)

صدقات صرف فقیروں، مسکینوں اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے ہیں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مقصود ہو، اور گردنیں چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے لیے، یہ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زکاۃ لینے کے مستحق یہی آٹھ ہیں، ان کو چھوڑ کر کسی اور مصرف پر زکاۃ خرچ نہیں کی جاسکتی، تاہم یہ ضروری نہیں کہ زکاۃ کی رقم ان آٹھوں پر خرچ کی جائے بلکہ ان میں سے جو زیادہ مناسب اور زیادہ ضرورت مند ہو اس پر اسے خرچ کردیا جائے۔

(۱) و (۲) فقراء اور مساکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ضرورت مند ہوں اور جن کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ جس سے وہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرسکیں، انہیں زکاۃ کی رقم سے اتنا پیسہ دیا جائے کہ جو زیادہ سے زیادہ ایک سال تک ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔

(۳) العالمین علیھا سے مراد زکاۃ اکٹھی کرنے والے اور اسے مستحقین میں تقسیم کرنے والے لوگ ہیں، انہیں زکاۃ کی رقم سے ان کے کام کے بقدر تنخواہ یا وظیفہ دیا جاسکتا ہے، خواہ وہ مالدار کیوں نہ ہوں۔

(۴) ''المؤلفۃ قلوبھم'' سے مراد کمزور ایمان والے نومسلم لوگ ہیں، یا وہ لوگ جن کے مسلمان ہونے کی امید ہو، یا وہ کفار جن کو مال دینے سے توقع ہو کہ وہ اپنے قبیلے یا علاقے کے لوگوں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے سے روکیں۔

(۵) "وفی الرقاب" سے مراد ہے غلاموں کو ان کے آقاؤں سے چھڑا کر آزاد کردینا۔

(۶) مقروض جو قرض واپس کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے زکاۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس نے قرضہ جائز مقصد کے لیے لیا ہو، اسی طرح وہ لوگ جن پر چٹی پڑ جائے یا ان کا کاروبار شدید خسارے کا شکار ہوجائے تو انہیں بھی زکاۃ دی جاسکتی ہے۔

(۷) "في سبيل الله" سے مراد جہاد اور دیگر تمام دینی مقاصد ہیں جو اللہ کی رضا کے موجب بنتے ہیں، مثلاً دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ میں زکاۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

(۸) وہ مسافر جس کا سفر جائز مقصد کے لیے ہو اور اس کا زاد راہ دوران سفر ختم ہوجائے اور وہ سفری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیسے کا محتاج ہو تو اسے بھی بقدر ضرورت زکاۃ دی جاسکتی ہے۔

تنبیہ (۱): یہ مستحقین زکاۃ اگر اپنے قریبی رشتہ داروں میں مل جائیں تو انہیں زکاۃ دینے سے دوگنا اجر ملتا ہے۔

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذى الرحم ثنتان: صدقة وصلة".

مسکین کو دیا جائے تو صدقہ ہوتا ہے اور اگر رشتہ دار کو دیا جائے تو صدقہ وصلہ رحمی دنوں ہوتے ہیں۔ (النسائی: ۲۵۸۲، الترمذی: ۶۵۸، وصححہ الالبانی)

تنبیہ (۲): اپنے بیوی بچوں اور والدین کو زکاۃ نہیں دی جاسکتی، ہاں بہن بھائی اگر ضرورت مند ہوں تو انہیں زکاۃ دینے سے دوگنا اجر ملے گا، اسی طرح دولتمند، کمانے والے تندرست لوگ، فاسق وفاجر لوگ اور آل رسول ﷺ کو بھی زکاۃ نہیں دی جاسکتی۔

آخر اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو زکاۃ ادا کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق دے، آمین۔

☆☆☆

چند صفحات شہر مبارک سے متعلق

عبدالاحد احسن جمیل/ مدینہ منورہ

رمضان کا روزہ

صوم کا لغوی معنی ہوتا ہے رکنا، کہتے ہیں صام النهار دن رک گیا جب سورج غروب ہوجاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی مریم علیہا السلام کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے: انی نذرت للرحمٰن صوما، یعنی میں نے رب کے نام کا روزہ مان رکھا ہے۔(دیکھئے: لسان العرب: ۱۲/۳۵۱، مصباح المنیر: ۱/۳۵۲، اور مغنی، أزابن قدامۃ: ۴/۳۲۳)

اور شرع میں روزہ کہتے ہیں: ایک مسلمان کا مخصوص شرائط مخصوص صفت کے ساتھ اللہ کی عبادت کی غرض سے کھانے پینے اور ہر قسم کے مفطرات سے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک، رک جانے کو۔(دیکھئے: الشرح الممتع: ۷/۱۸۶)

رمضان المبارک کے چند فضائل:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اذا دخل رمضان فتحت أبواب السماء (وفی روایة، أفرد بها البخاری: فتحت أبواب الجنة)، وغلقت أبواب النار وصفدت الشياطين، (وفی روایة، أفردبها مسلم: وفتحت أبواب الرحمة)، وغلقت أبواب جهنم وسلسلت الشياطين . (دیکھئے: صحیح بخاری، حدیث: ۱۸۹۸، اور صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۷۹)، جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو رب العالمین اپنی رحمت اور جنت کے (سارے) دروازے کھول دیتا ہے اور جہنم کے (سارے) دروازوں کو بند کر دیتا ہے اور سرکش شیطان وجن کو قید کر دیتا ہے۔

اور حضرت أبوسلمہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ نبی ﷺ نے فرمایا: من صام رمضان ايمانا واحتسابا، ومن قام رمضان ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه، ومن قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه . (دیکھئے: صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۰۱، اور صحیح مسلم: ۷۶۰)۔جس نے رمضان کا روزہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اخلاص کے ساتھ رکھا تو اللہ تعالی اس کے گذشتہ تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔

اور ایک اعرابی صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: صوم شهر الصبر، وثلاثة أيام من كل شهر يذهبن حر الصدر . (دیکھئے: مسند البزار، حدیث: ۱۰۵۷، اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الترغیب والترھیب: ۱/۵۹۹، میں صحیح قرار دیا ہے)، صبر یعنی رمضان کے مہینہ کا روزہ اور ہر مہینہ کا تین روزہ سینہ کو گندگی اور سختی سے پاک کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار ایسی حدیثی ہیں جو اس بات پر دلا دلت کرتی ہیں کہ رمضان کا روزہ کس قدر اہمیت اور فضیلت کا حامل ہے، آج جب رب العالمین نے اس ماہ مبارک سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا ہے تو اب اگر کوئی اپنے آپ کو نہ بخشوالے تو اس سے بڑا خائب وخاسر کون ہوسکتا ہے، چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: أن النبی ﷺ رقی المنبر فقال : آمین، آمین، آمین . فقیل یا رسول الله ماکنت تصنع هذا؟ فقال : قال لی جبرئیل علیه السلام رغم أنف عبد دخل علیه رمضان فلم یغفر له، فقلت آمین، ثم قال رغم أنف عبد ذکرت عنده فلم یصل علیك، فقلت : آمین، ثم قال رغم أنف عبد أدرك والدیه أو أحدهما فلم یدخل الجنة ، فقلت : آمین . (دیکھئے: مسند أحمد: ۲/۲۴۶، ۲۵۴، اور صحیح ابن خزیمۃ: ۳/۱۹۲، اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح أدب المفرد، حدیث: ۶۴۶، میں حسن صحیح کہا ہے)۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ منبر پر چڑھے اور فرمایا: آمین، آمین، آمین، اس پر آپ کے صحابہ نے آپ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) آپ ایسا نہیں کرتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس نے رمضان کے مہینہ کو پایا اور اس کی بخشش نہ ہوئی۔

روزہ کے فوائد:

روزہ کے روحانی اجتماعی اور طبی بہت سے فوائد ہیں، استاذ محترم علامہ شیخ ابوبکر جابر جزائری حفظہ اللہ اپنی مشہور زمانہ کتاب منہاج المسلم میں فرماتے ہیں: روزہ کے روحانی فوائد میں سے ہے کہ انسان صبر کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کے تقوی میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اور نفس پر کنٹرول کرنا سیکھ لیتا ہے، اور روزہ رکھنے سے تقوی کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اسی کو رب العالمین نے اپنے کلام میں روزہ کا سب سے بڑا فائدہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ رب العالمین فرماتا ہے: ﴿ یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون﴾ (البقرۃ: ۱۸۳) اے ایمان والوں تم پر روزہ فرض قرار دیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے کہ لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تا کہ تم تقوی والے (یعنی متقی) بن جاؤ۔

اور روزہ کے اجتماعی فوائد میں سے ہے کہ اس کے ذریعہ امت میں اتحاد واتفاق پیدا ہوتا ہے، اور لوگ عدل ومساوات کا برتاؤ کرتے ہیں، اور اس سے مسلمانوں کے درمیان احسان اور رحمت جیسی صفت پیدا ہوتی ہے، اور اس کے بڑے اجتماعی فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرہ فساد وبگاڑ سے محفوظ رہتا ہے۔

اور روزہ کے طبی فوائد میں سے ہے کہ روزہ انسان کے معدہ کو صاف کر کے اس کو سکون اور اطمینان بخشتا ہے، اور اس کے بدن کو فضلات اور رواسب سے پاک کرتا ہے، اور اس کے اندر جو زائد چربی ہوتی ہے اس کو کم کرتا ہے اور اس کے بھاری بھر کم پیٹ کو کم کرتا ہے۔ (منہاج المسلم، ص: ۳۰۵)۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صوموا تصحوا۔ (دیکھئے مصنف عبدالرزاق: ۱۱/۴۳۴)۔

رمضان کے روزہ کا حکم:

رمضان کا روزہ ہر مسلم، عاقل، بالغ، قادر، صحت مند، مقیم شخص پر فرض اور واجب ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿ یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون﴾ (البقرة : ۱۸۳) . اے ایمان والوں تم پر روزہ فرض قرار دیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے کہ لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تا کہ تم تقوی والے (یعنی متقی) بن جاؤ۔ اور فرمایا رب العالمین نے: وقال جل شأنه : ﴿ شهر رمضان الذی أنزل فیه القرآن هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان فمن شهد منکم الشهر فلیصمه﴾، (البقرة : ۱۸٤) ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کی ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں، پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے تو اسے چاہیئے کہ اس مہینہ کا روزہ رکھے۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: بنی الاسلام علی خمس شهادة أن لا اله الا الله وأن محمدا رسول الله، واقام الصلاة ، وایتاء الزکاة ، وحج البیت ، وصوم رمضان . (دیکھئے: صحیح بخاری، حدیث: ۸، اور صحیح مسلم: ۱٦) اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، انسان اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرے، زکاۃ دے، بیت اللہ کا حج کرے، اور رمضان کا روزہ رکھے۔

اور اس بات پر پوری امت متفق ہے کہ رمضان کا روزہ فرض ہے، اور رمضان کا روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔

رمضان کے روزہ کی فرضیت:

رمضان کا روزہ کب فرض ہوا، چنانچہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبی ﷺ نے صرف نو (۹) سال رمضان کا روزہ رکھا جس سے صاف صاف اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ رمضان کے روزہ کی فرضیت سنہ دو (۲) ہجری میں ہوئی ہے۔ (مجموع فتاوی: ۲۵/۲۹۵)

اور اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ کے مشہور شاگرد امام ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: روزہ سنہ دو (۲) ہجری میں فرض ہوا ہے۔ (زاد المعاد: ۲/۳۰)

رمضان کی فرضیت کی حکمت:

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب رمضان کے فوائد عقل سلیمہ سے ثابت ہو گئے اور مستقیم فطرت نے اس کی شہادت دی تو رب العالمین نے بطور رحمت و احسان اپنے بندوں پر روزہ فرض قرار دیا۔ (دیکھیں: زاد المعاد: ۲/۳۰)

اور امام ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ابو سلیمان درانی نے فرمایا کہ جب پیٹ خالی بھوکا ہوتا ہے تو دل صاف ہوتا اور اس کے اندر رقت اور تڑپ ہوتی ہے اور جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو دل اندھا ہو جاتا ہے۔ (مجالس شہر رمضان، ص: ۴۲)۔

رمضان کی فرضیت کیوں سنہ دو ہجری تک متأخر ہوئی اس کو وضاحت کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ

فرماتے ہیں: اگر ہمارے پاس غذائے لطیف نہیں، آب خوش گوار نہیں، زوجہ جمیل نہیں، غرض وہ تمام چیزیں نہیں جن کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو ایسی حالت میں ان تمام چیزوں سے منہ موڑ لینا، کوئی حقیقی تقوی نہ ہوگا، بلکہ ایک خیوری کی شکل ہوگی، کیونکہ اگر روزہ نہ رکھیں جب بھی دن بھر فاقہ سے گزرتا ہے۔ پس اگر مکہ میں روزہ فرض کر دیا جاتا تو اسی قسم کا ایک مجبورانہ تقوی ہوتا لیکن مدینہ کی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں زمین اپنے خزانے اگل رہی تھی۔ خوبصورت کنیزیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ فتوحات کے آغاز نے طرح طرح کی نعمتوں کے انبار لگا دیئے تھے اور آزلوی کے احساس نے ان کے جذبات کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا ایسی حالت میں اگر کوئی شخص ان لذائذ طیبہ سے احتراز کرتا تو یہ بے شبہ اس کے قوت ایمان وضبط نفس کی دلیل ہوتی۔ اسلام درحقیقت صبر وتوکل کی ایک آزمائش اور زہد وتقوی کا امتحان گاہ ہے۔ اس لئے صبر وقناعت کے لئے اس نے مسلمانوں کے زہد وتقوی کو روزے کے ساتھ آزمایا۔ اور ایسے وقت میں آزمایا جب کہ لغزش اور ٹھوکر کے اسباب فراہم ہونا شروع ہو گئے۔ (انتخاب الہلال، ص: ۱۸۷)

رمضان کے روزہ کی فرضیت کیسے؟

رمضان کا روزہ یا تو شعبان کے تیس (۳۰) دن کے پورے ہونے سے فرض ہوگا، یا شعبان کے انتیسویں دن چاند کی رؤیت سے، اس کی دلیل اللہ رب العالمین کا فرمان ہے، چنانچہ اللہ تعالی کہتا ہے: فمن شهد منكم الشهر فليصمه، جو کوئی بھی رمضان کا مہینہ پائے تو اسے چاہئے کہ اس کا روزہ رکھے۔ اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، اور روزہ رکھنا نہ چھوڑو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو، اور اگر انتیسویں دن کی فضا غبار آلود ہو اور چاند نہ دکھے تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔ (دیکھئے: صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۰۰، ۱۹۰۶، اور صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۸۰۔۱۰۸۱)

چاند کی رؤیت میں اختلاف مطالع کا اعتبار:

قمری مہینوں کے آغاز واختتام کے لیے اسلام نے اصل اعتبار رؤیت کا کیا ہے اور ہر ملک کے لئے اسی ملک کی رؤیت کا ہی اعتبار ہوگا، یعنی اختلاف مطالع کا اعتبار، اس کی دلیل حضرت کریب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں شام آیا، اور رمضان کا چاند نظر آ گیا اور میں شام میں ہی تھا، اور میں نے وہاں چاند جمعہ کی رات میں دیکھا، اور پھر میں مہینہ کے آخر میں مدینہ آیا، تو مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے چاند کے بارے میں پوچھا اور یہ پوچھا کہ تم لوگوں نے چاند کب دیکھا؟ تو میں نے ان سے کہا کہ ہم نے جمعہ کی رات میں چاند دیکھا، اس پر پوچھا تم نے بھی چاند دیکھا تھا تو میں نے کہا ہاں میں نے بھی دیکھا، اور لوگوں نے بھی دیکھا، اور ان لوگوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا، اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لیکن ہم نے ہفتہ (یعنی سنیچر) کی رات دیکھا تھا، اس لئے ہم روزہ رکھیں گے یہاں تک کہ تیس دن پورا کر لیں، حضرت کریب کہتے ہیں کہ اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا معاویہ کی رؤیت اور ان کا روزہ رکھنا ہمارے لئے کافی نہیں؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ نے کچھ کہا اور پھر کہا کہ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ (دیکھئے: صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۸۷)

اختلاف مطالع کے اعتبار کے سلسلہ میں امام عبدالرحمٰن البسام رحمہ اللہ اپنی کتاب "توضیح الأحکام شرح بلوغ المرام" میں لکھتے ہیں کہ: صحیح بات یہ کہ ہر ملک کے لئے وہیں کی رؤیت کا التزام کیا جائے، اور جو اس سے متصل اسی جہت میں ہوں۔

اور یہی امام نووی وحافظ ابن حجر رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔ (دیکھئے: شرح صحیح مسلم: ۱۹۷/۷، اور فتح الباری: ۱۴۷/۴۔۱۴۸)

اور امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے تو اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ مطالع کے اختلاف کا اعتبار کیا جائے گا۔ (دیکھئے: بدایۃ المجتہد: ۲۸۸/۱)

اور یہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی مسلک ہے۔ (مجموع فتاوی: ۱۰۳/۲۵)

اگر آسمان غبار آلود ہو:

اگر آسمان غبار آلود ہو اور چاند انتیسویں رات نہ دکھے تو تیس دن کا مہینہ پورا کر لینا چاہئے، اور شک کے دن میں روزہ نہیں رکھنا چاہئے، چنانچہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ: جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (اس حدیث کو امام بخاری نے تعلیقا روایت کیا ہے، اور ان کے علاوہ ائمہ کے موصولا روایت کیا ہے، چنانچہ دیکھیں: أبوداود، حدیث: ۲۳۳۴، اور یہ حدیث صحیح ہے)

اور اسی مسلک کو امام بخاری (صحیح بخاری، کتاب الصوم، ۱۴۳/۳)، امام ترمذی (تحفۃ الأحوذی: ۲۹۸/۴۔۲۹۹)، امام بن حجر (فتح الباری: ۱۴۶/۴)، شیخ الحدیث عبیداللہ مبارکپوری (مرعاۃ المفاتیح: ۴۳۴/۶)، شیخ ابن باز (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ: ۱۱۷/۱۰۔۱۱۸، فتوی نمبر: ۷۹۵۶) اور شیخ ابن عثیمین (الشرح الممتع: ۳۰۷/۶) رحمہم اللہ نے راجح قرار دیا ہے۔

روزہ کی نیت:

روزہ کی نیت کرنا واجب اور فرض ہے اور اس کا سب سے مستحب وقت طلوع فجر سے کچھ پہلے ہے جو نبی کریم ﷺ نے سحری کا وقت قرار دیا ہے، ہاں اگر آدمی رات میں کسی وقت میں بھی رمضان کے روزے کی نیت کر لے تو اس کی نیت ہو جائے گی، برخلاف نفلی روزہ کہ اس کی نیت دن میں بھی اگر انسان کرتا ہے تو کفایت ہوگی، مگر رمضان کے روزہ کی نیت رات کے کسی حصہ میں کرنا ہے۔

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور نہ ہی اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے کچھ ثابت ہے۔ اور جو کچھ الفاظِ نیت عوام کے درمیان رائج ہیں ان کا حقیقت سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی ان پر عمل کرتا ہے تو بلاشبہ وہ بدعت کا ارتکاب کرتا ہے۔

سحری کا بیان:

سحری ایک بابرکت کھانا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: السحور بركة ، فلا تدعوه ولو أن يجرع أحدكم جرعة ماء ، فان الله وملائكته يصلون على المتسحرين . (مسند أحمد، دیکھیں: صحیح الترغیب

والترھیب ، حدیث:۱۰۶۲)، سحری ایک بابرکت کھانا ہے، اس لئے اسے نہ چھوڑو اگر چہ ایک گھونٹ پانی ہی پی لو، کیونکہ اللہ تعالی سحری کھانے والوں پر برکت نازل کرتا ہے اور فرشتے ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔

سحری کا وقت رات کا آخری پہر ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جائے، اور مستحب وقت طلوع فجر سے تھوڑا پہلے ہے۔

رمضان کے دن میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ انسان ہر قسم کے گناہوں اور خرافات سے دور رہے۔ کیونکہ روزہ کو اللہ تعالی نے اپنے لئے خاص کر رکھا ہے۔

افطار کا بیان:

نبی کریم ﷺ افطار میں جلدی کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: لا يزال الناس بخير، ما عجلوا الفطر . (صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۵۷، اور صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۹۸) لوگ برابر بھلائی میں رہیں گے جب تک افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وقت ہونے سے پہلے ہی افطار کر لیا جائے۔

اور نبی کریم ﷺ کی افطار میں یہ سنت تھی کہ آپ رطب کھجور سے افطار کرتے اگر رطب میسر نہ ہوتی تو کسی بھی عام کھجور سے افطار کر لیتے، اگر وہ بھی میسر نہ ہوتے تو آپ پانی کے چند گھوٹ سے افطار کر لیتے، اور آپ نماز پڑھنے سے پہلے افطار کرتے تھے۔ (دیکھیں: جامع ترمذی، حدیث: ۶۹۲، اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے)۔

اور نبی کریم ﷺ افطار سے پہلے اللہ تعالی سے بکثرت دعا کرتے تھے کیونکہ وہ دعا کی مقبولیت کا وقت ہے، اور آپ ﷺ یہ کہہ کر افطار کرتے تھے کہ: ذهب الظمأ ، وابتلت العروق ، وثبت الأجر انشاء الله .(سنن ابوداود، حدیث: ۲۳۵۷، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیں: سنن دارقطنی: ۱۸۵/۲، حدیث: ۲۵)، پیاس مٹ گئی، رگیں تر ہو گئیں، اور اس کا اجر انشاء اللہ محفوظ ہو گیا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دعا افطار کے بعد کی ہے ان کی تردید خود امام ابوداود رحمہ اللہ نے "القول عند الافطار" باب باندھ کر ہی کر دی ہے۔

سفر میں روزہ کا حکم:

اگر کوئی شخص رمضان کے مہینہ میں سفر کرتا ہے تو اس کے لئے روزہ نہ رکھنا مستحب ہے، ہاں اگر کسی پر روزہ کی قضا شاق ہو تو اسے روزہ رکھنا ہی افضل ہے۔

اور اگر کوئی شخص دن کے کسی حصہ میں سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس دن کا روزہ چھوڑنا اس کے لئے جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابوبصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ وہ رمضان کے مہینہ میں سفر کو نکلے ابھی تھوڑا ہی آگے بڑھے تھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا اور ان کا کھانا حاضر کیا گیا، اور ابھی گھر نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے دسترخوان لگوایا اور لوگوں کو کھانے پر طلب کیا، تو کچھ لوگوں نے ان سے کہا کیا گھر نہیں دکھ رہے ہیں؟ اس پر حضرت ابوبصرہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا تم

لوگ مجھے نبی کریم ﷺ کی سنت سے دور کرنا چاہتے ہو؟ اور کھانا کھالیا۔ (سنن ابوداود، حدیث: ۲۴۱۲، اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھئے: ارواء الغلیل: ۶۳/۴، حدیث: ۹۲۸)

اسی طرح محمد بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے، تو میں نے آپ کے لئے سواری کا انتظام کیا، پھر انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے سفر کا لباس پہنا، اور کھانا طلب کیا، اور اسے نوش فرمایا، محمد بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ کیا یہ سنت ہے تو انہوں نے کہا ہاں سنت ہے، اور سواری پر سوار ہو گئے، (جامع ترمذی، حدیث: ۷۹۶، اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے)، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ وقت غروب آفتاب کے بالکل قریب تر تھا۔ (سنن دارقطنی: ۱۸۷/۲۔۱۸۸، حدیث: ۳۷)۔

ان آثار پر تعلیق لگاتے ہوئے امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آثار اس بات پر صریح دال ہیں کہ جو کوئی رمضان میں دن کے کسی وقت میں میں سفر کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے روزہ چھوڑنے اور بعد میں اس کی قضا کرنے کی اجازت ہے۔ (زاد المعاد: ۵۷/۲)۔

کتنی مسافت کے سفر پر انسان کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، اس کی کوئی تحدید شریعت میں نہیں ہے، اس لئے جو بات مناسب اور حقیقت کے عین مطابق لگتی ہے وہ یہ کہ آدمی اتنی مسافت طے کرلے کہ عرف میں اسے مسافر کہا جائے، اسی کو امام ابن تیمیہ، امام ابن القیم، شیخ ابن عثیمین، شیخ سعدی رحمہم اللہ نے راجح قرار دیا ہے اور امام ابن قدامہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (دیکھیں: مجموع فتاوی، از ابن تیمیہ: ۱۱/۲۴۔۱۳۵، اور زاد المعاد: ۵۵/۲، اور مجموع فتاوی، از ابن عثیمین: ۲۵۲/۱۵۔۴۵۱، اور اختیارات از سعدی، ص: ۶۵)

جس شخص پر فجر طلوع ہوئی جنابت کی حالت میں:

جس شخص نے اپنی بیوی سے حاجت پوری کیا، یا اس کو احتلام ہو گیا اور وہ اسی حال میں رہا یہاں تک کے فجر طلوع ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ اٹھے اور غسل کرے اور نماز پڑھ کر اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ حضرت عائشہ اور میمونہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ دونوں کہتی ہیں کہ نبی ﷺ رمضان میں صبح کرتے اس حال میں کہ آپ جنبی ہوتے جماع سے احتلام کے علاوہ، اور پھر روزہ رکھتے۔ (صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۳۱۔۱۹۳۲، اور صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۸۹)۔

روزہ کی قضا:

چھوٹے ہوئے روزہ کی قضا کرنا فوری طور پر واجب نہیں بلکہ انساں اگلے رمضان کے آنے تک کبھی بھی روزہ کی قضا کرسکتا ہے، اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ کی حدیث ہے، چنانچہ وہ فرماتی ہیں کہ میرے اوپر روزہ باقی ہوتا اور میں اس کو شعبان میں ہی پورا کر پاتی تھی۔ امام یحیی فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ کہ وہ نبی ﷺ کی وجہ سے مشغول ہوتی تھیں۔ (صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۵۰، اور صحیح مسلم، حدیث: ۱۱۴۶)۔

اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ جس شخص کا روزہ چھوٹ جائے اسے چاہئے کہ وقت ملتے ہی اس کی قضاء کر لے، اب اگر کوئی وقت ملنے پر بھی روزہ نہ رکھے اور کسی وجہ سے وہ روزہ رکھ ہی نہ سکے تو بلا شبہ وہ گناہ گار ہوگا۔

جو شخص انتقال فرما جائے اور اس پر روزہ باقی ہو:

جو شخص انتقال فرما جائے اور اس پر روزہ باقی ہو، اور اسے روزہ رکھنے کی فرصت ہی کسی وجہ سے نہ ملے تو علماء کا اس بات پر اتفاق ہے اس کے اولیاء پر اس کی طرف سے روزہ کی قضاء کرنا واجب نہیں ہے۔ (دیکھئے: مجموع فتاوی از ابن باز: ۱۵/۳۶۳)، ہاں اگر کوئی اگر وقت پانے کے باوجود روزے کی قضاء نہیں کرتا ہے تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اس میں بھی راجح قول یہی ہے کہ اس کے روزہ کی قضا اس کے رشتہ داروں پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ (دیکھئے: شرح صحیح مسلم از امام نووی: ۸/۶۲۔۲۷، اور فتح الباری: ۴/۲۲۸۔۲۲۹، حدیث: ۱۹۵۳، اور شرح الکبیر: ۷/۵۰۱۔۵۰۳، اور کتاب الفروع از ابن مفلح: ۵/۷۰۶۴، اور نیل الأوطار: ۳/۱۷۸۔۱۸۱، اور شرح الممتع از ابن عثیمین: ۶/۴۵۳۔۴۵۸)

کیا تیس سے زائد روزہ رکھے جائیں گے:

جس شخص کا مہینہ تیس دن سے زائد ہو جائے گا وہ تیس دن روزہ رکھنے کے بعد روزہ نہیں رکھے گا، لیکن عوام کے سامنے کھانے پینے سے اسے پرہیز کرنا ہوگا۔ مثلا ایک شخص نے روزہ رکھنا سعودی عربیہ میں شروع کیا پھر وہ کچھ دنوں بعد سفر کر کے ہندوستان چلا آیا تو چونکہ عموما سعودی عربیہ اور ہندوستان کے قمری مہینہ میں ایک یا دو دن کا فرق رہتا ہے، سعودی عربیہ میں چاند ایک دو دن پہلے نظر آتا ہے اور ہندوستان میں ایک دو دن بعد، تو اب جو شخص سعودی عربیہ کے چاند کے حساب سے روزہ رکھنا شروع کرے اور پھر وہ ہندوستان آجائے تو کیا وہ تیس سے زائد روزہ رکھے گا یا تیس پر اکتفا کرے گا تو اس میں علماء کے دو اقوال ہیں اور جو بات مناسب سمجھ میں آتی ہے اور جس کے سلسلہ میں حدیث بھی ہے وہ یہ کہ صرف تیس روزہ ہی رکھے، تیس سے زائد نہیں، اور جو لوگ تیس سے زائد کی بات کہتے ہیں اس کی وہ جو دلیل دیتے ہیں اس دلیل کی بنیاد پر اگر ایک شخص ہندوستان سے سفر کر کے سعودی عربیہ جاتا ہے تو اس کے اٹھائیس روزہ ہوں گے تو کیا وہ اسی پر اکتفا کرے گا، پر یہ بات کوئی بھی نہیں کہتا، لہذا یہ ثابت ہوا کہ صرف تیس روزہ ہی رکھنے ہیں اس سے زائد نہیں، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ تیس یا انتیس دن کا ہوتا ہے، تو اب وہ اس سے زائد کیسے رکھ سکتا ہے۔

انہیں چند مسائل کے بیان پر میں اکتفا کرتا ہوں میں نے جو ذکر کیا اگر صحیح ہے تو اللہ کا فضل وانعام ہے، اور اگر غلط ہے تو مردود ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تو میرے اس عمل کو خالص اپنی رضا کے لئے بنا لے، اور اس سے ہمیں اور سارے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، تیرے ہی قبضہ میں ہے فائدہ اور نقصان پہنچانا۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆

حرم مکی کے بعض مقامات کی دینی وتاریخی اہمیت

تحریر: رئاسہ عامہ شؤون المسجد الحرام والمسجد النبوی
سلسلۃ فضائل واحکام

ترجمانی: محمد أظہر بن أصغر علی امام مہدی السّلفی
جامعہ نگر، نئی دلی

حرم مکی شریف کی عظمت اور اس کا احترام ہر مسلمان کے دل میں ہے اور اس میں موجود مختلف مقامات بھی بڑے محترم اور فضائل کے حامل ہیں، ذیل درج سطور میں ان مقامات کی شرعی وتاریخی حیثیت اور ان سے متعلق فضائل واحکام بیان کئے گئے ہیں، دراصل مضمون "الرئاسة العامة لشؤون المسجد الحرام والمسجد النبوی" کی طرف سے شائع کردہ ہے اور اس کو اردو جامہ عزیزم محمد اظہر اصغر علی السّلفی سلمہ اللہ تعالی نے پہنایا ہے، مترجم کے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حجر (حطیم)

حجر کی تعریف: حاء کے زیر اور جیم کے جزم کے ساتھ ''حجر اس کھلی ہوئی بنیاد کا نام ہے جو خانہ کعبہ کے شمالی دیوار اور اس چھوٹی دیوار (جو خانہ کعبہ کے باہر میزاب کے سامنے کی نیچے کی ایک دیوار ہے) کے مابین واقع ہے، اور مکمل حجر جو کہ نصف دائرے کی شکل اختیار کی ہوئی ہے خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہے، بلکہ خانہ کعبہ سے صرف چھ ہاتھ جو موجودہ دور کے پیمائش کے حساب سے تین میٹر کی دوری تک واقع ہے۔

حجر کو حجر اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب قریش نے بیت اللہ شریف کی از سر نو تعمیر کے غرض سے جو مال اکٹھا کیا وہ کم پڑ گیا جس کی وجہ سے وہ خانہ کعبہ کی پیمائش میں کمی کردی اس لیے کہ ان کے پاس اس کی تعمیر کے لیے حلال پیسے جمع نہ ہو سکے، اور آج اسی بچی اور چھٹی ہوئی جگہ کو حجر (حطیم) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: '' يا عائشة لولا أن قومك حيثوا عهد بشرك لهدمت الكعبة فالزقتها بالارض وجعلت لها بابا شرقيا وبابا غربيا فيها ستة أذرع من الحجر فان قريشا اقتصرتها حين بنت الكعبة''(بخاری ومسلم)۔ ترجمہ: ''اے عائشہ! اگر تمہاری قوم کے لوگ زمانہ جاہلیت سے قریب نہ ہوتے تو میں خانہ کعبہ کو منہدم کر کے اس کو زمین سے ملا دیتا اور اسمیں ایک شرقی اور ایک غربی دروازہ کھول دیتا اور کعبہ میں میں چھ ہاتھ کی توسیع کر دیتا جسکو قریش نے اس کی تعمیر کے وقت چھوڑ دیا تھا''۔ (بخاری ومسلم)

فضائل واحکام: حطیم کی بھی فضیلت وہی ہے جو کہ بیت اللہ شریف کی ہے، اس لیے کہ یہ بھی اس کا ایک جزء ہے، اس لیے اگر

کسی نے حطیم میں نماز پڑھا تو گویا اس نے بیت اللہ شریف کے اندر نماز پڑھا۔حجر میں نماز پڑھنا مشروع ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں (كنت أحب أن ادخل البيت فأصلى فيه فأخذ رسول الله ﷺ بيدى فأدخلنى الحجر فقال : اذا أردت دخول البيت فصلى هاهنا فانما هو قطعة من البيت) میں چاہتی تھی کہ خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھوں پس رسول اکرم ﷺ نے میرا ہاتھ تھاما اور حجر میں داخل کر دیا اور فرمایا اگر تو کعبہ کے اندر نماز پڑھنا چاہتی ہے کہ تو تم یہاں (حجر) میں نماز پڑھو کیونکہ وہ خانہ کعبہ کا ایک ٹکڑا ہے (نسائی، ابوداود، ترمذی)۔

مذکورہ احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حجر کی جگہوں کا حکم وہی ہے جو خانہ کعبہ کا ہے چنانچہ داخل حجر سے طواف کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ داخل حجر سے طواف کرنا گویا خانہ کعبہ کے بعض حصے کا طواف کرنا ہے اور بعض حصہ کا چھوڑنا لازم آئیگا جبکہ پورے خانہ کعبہ کا طواف کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت والجلال حکم دیتا ہے کہ پورے خانہ کعبہ کا طواف کرو اللہ کا ارشاد ہے (واليطوفوا بالبيت العتيق) آية ۲۹ الحج۔

اور اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ''حجر خانہ کعبہ کا ایک حصہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے پیچھے سے طواف کی ہے اور فرمایا ''خذو عنى مناسككم'' تم لوگ مجھ سے حج کے مسائل سیکھ لو۔ (بخاری)

حجر کے متعلق بعض غلطیاں اور اس کی نشان دہی:

بہت ساری ایسی غلطیاں ہیں جو مشہور ہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا یہ اعتقاد ہیکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حجر میں مدفون ہیں اس سے بڑھکر بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حجر میں ستر انبیاء علیہم السلام کی قبریں ہیں، جو کہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔اس لئے کہ حجر کا حصہ کعبہ کا حصہ ہے اور یہ بھلا کیسے ہوسکتا کہ نبیوں کو خانہ کعبہ میں دفن کیا گیا۔اگر بفرض محال مان لیا جائے تو بھی ہمارے لئے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہیکہ ہم ان قبروں کو اپنے پیروں سے دن ورات روندیں جبکہ وہ سب سے بزرگ اور بہترین لوگ تھے ساتھ ہی نبی آخر الزماں ﷺ نے ہمیں قبروں پر مسجد بنانے سے منع فرمایا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قاتل الله اليهود اتخذوا قبور انبيائهم مساجدا'' (بخار ی ومسلم'' وفى رواية مسلم قال: ''والنصارى'' ترجمہ: اللہ تعالی یہودیوں کو غارت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا۔اور مسلم کے ایک روایت میں نصاری کا ذکر ہے۔

جب آپ ﷺ سے اُم حبیبہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہما نے ان کنیساوں کا ذکر کیا جسکو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''ان أولئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بنوا على قبره مسجدا وصورا فيه تلك الصور فأولئك شرار الخلق عند الله يوم القيامه'' (البخارى ومسلم)۔

ترجمہ: جب ان میں سے کوئی نیک آدمی مرتا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس پر اس کی تصویر بنا کر نصب کر دیتے وہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے بدترین لوگ ہونگے۔

ملتزم

ملتزم کی تعریف: ملتزم اس دیوار کو کہتے ہیں جو باب کعبہ اور حجر اسود کے درمیان واقع ہے اس سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس کو امام بیہقی نے کبریٰ اور امام مالک نے مؤطا میں اور عبدالرزاق نے اپنی منصف میں ذکر کیا ہے۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: "المتزم بين الركن والباب" أخرجه البيهقی فی الكبری ومالك فی المؤطا وعبدالرزاق فی مصنفه۔ کہ ملتزم رکن یمانی اور باب کعبہ کی درمیانی دیوار ہے۔

اس کی چوڑائی تقریباً چار قدم کے برابر ہے جو موجودہ دور کی پیائش کے حساب سے تقریباً دو میٹر ہوتا ہے۔

ملتزم کو ملتزم کیوں کہا جاتا ہے: لوگوں کے کثرت سے اس کے ساتھ چمٹے رہنے اور اس سے معانقہ کرنے کی وجہ سے اس کو ملتزم کہا جاتا ہے۔ اور اس کے ناموں میں سے ایک نام 'مدعیٰ' اور 'متعوذ' بھی ہے جس کا ثبوت جلیل القدر صحابی حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ملتا ہے ۔" عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: الملتزم،والمدعی ،والمتعوذ، مابين الحجر والباب"۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ملتزم، مدعیٰ ،متعوذ حجر اسود اور باب (کعبہ) کے درمیان واقع ہے۔

ملتزم کے فضائل وخصائص: ملتزم ان جگہوں میں سے ایک ہے جہاں پر دعائیں قبول ہوتی ہیں، جس کا پتا بیہقی کی اس روایت سے چلتا ہے جس میں ہے کہ ابوزبیر اور ابن عباسؓ ملتزم سے چمٹے رہتے تھے اور کہتے تھے "لايلزم ما بينهما أحد يسأل الله شيئا الا أعطاه اياه"۔(أخرجه البيهقی) کہ کوئی بھی شخص ملتزم سے چمٹ کر کسی بھی چیز کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتا ہے۔

ابوزبیر فرماتے ہیں کہ میں نے ملتزم کے پاس اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ہماری دعاء قبول فرمائی۔ ابن عبدالبرؒ نے 'استذکار' میں مجاہد بن جبر کا قول نقل کرتے ہیں کہ "يدعىٰ ما بين الركن والباب، الملتزم، فقل انسان يسأل الله شيئا ويستعيذ من شئی الا أعطاه" رکن اور دروازہ کے درمیانی حصہ کو ملتزم کہا جاتا ہے، پس (وہاں) کم ہی لوگ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرتے ہیں اور استعاذہ کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتا ہے۔

ملتزم کے شرعی اُحکام: آدمی کے لیے مشروع ہے کہ وہ کھڑے ہو کر اپنے سینے کو، اپنے ہاتھ کو، اور اپنے رخسار کو ملتزم سے چمٹائے۔ جیسا کہ ابوداؤد، ابن ماجہ، اور بیہقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔"فعن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: طفت مع عبدالله بن عمرو رضی الله عنهما فلما فرغنا من السبع ركعنا فی دبر الكعبة فقلت: ألا نتعوذ بالله من النار؟ قال: "أعوذ بالله من النار"،قال:" مضى فاستلم الركن، ثم قام بين الحجر والباب فألصق صدره ويديه وخده اليه"، ثم قال:" هكذا رأيت رسول الله ﷺ"(أخرجه أبوداؤد وابن ماجة والبيهقی فی الكبری)۔ عمرو اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمروؓ کے ساتھ طواف کیا، جب ہم لوگوں نے سات چکر پورا کر لیے تو خانہ کعبہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ میں نے کہا: کیا ہم اللہ سے جہنم سے پناہ طلب نہ کریں، تو ابن عمرو نے کہا 'میں اللہ تعالیٰ سے اس کے جہنم کی پناہ مانگتا ہوں'۔، راویٔ حدیث بیان کرتے ہیں کہ پھر وہ حجر اسود سے گزرتے ہوئے اس کا استلام کیا اور حجر اسود اور باب کعبہ کے مابین کھڑے ہو کر

اپنے سینے اور ہاتھ اور رخسار کو دیوار سے چمٹایا۔ پھر راوئ حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ کو ایسا ہی کرتے ہوئے دیکھا۔

ملتزم کے تعلق سے برتی جانے والی چند غلطیاں:

☆ ملتزم کے تعلق سے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی بذات خود نفع ونقصان کا مالک ہے جب کہ ایسا اعتقاد رکھنا توحید کے منافی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جس کا کوئی شریک وساجھی نہیں وہ وحدہ لاشریک لہ ہے ساتھ ہی وہ ہر طرح کے نفع ونقصان کا مالک کل بھی ہے۔

☆ مردوں اور عورتوں کا آپس میں اختلاط اور دھکا کی ایک غیر شرعی عمل ہے، چاہے جہاں کہیں بھی ہو، مسلمان کو حتی المقدور اس سے بچنا چاہیے۔ بہت سارے لوگ ملتزم کے چکر میں شرعی حدود قیود کو بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ جو کہ کسی بھی حال میں روا اور درست نہیں ہے۔جس میں سے ایک اختلاط مرد وزن بھی ہے۔

☆ جس کو ملتزم پر جگہ مل جاتی ہے وہ چاہتا ہے کہ صبح سے شام تک میں ہی اکیلا یہاں کھڑا رہوں۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر آدمی اپنے دوسرے بھائی کا خیال رکھے۔ پیارے رسول ﷺ کی پیاری حدیث ہے:''لا یومن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه'' تم میں کا کوئی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی (چیز) پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔اگر ہر آدمی اس حدیث کے مطابق عمل کرے تو میرے خیال خام میں دنیا کا سارا کرپشن اور گناہ دور ہوسکتا ہے انسان حقیقی انسان بن کر زندگی گزار سکتا ہے، ایک دوسرے سے محبت کرنے لگ سکتا ہے، حسد کینا کپٹ بغض وعناد جیسے مہلک بیماری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آدم کے بیٹیوں اور بیٹیوں کی یہ دنیا نور ونکہت بن سکتی ہے۔چاہے وہ حج کا موسم ہو یا عمرہ کا، کہیں بھی زائرین کو زحمت اٹھانی نہیں پڑے گی۔

مقام ابراہیم

مقام کی تعریف: وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہوکر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، جیسا کہ آج بھی جب عمارت کی دیواریں اونچی ہوجاتی ہیں اور معمار وہاں تک نہیں پہنچ پاتے تو مختلف قسم کی سیڑھیاں تیار کرتے ہیں، اور معلوم ہے کہ آج کی طرح دنیا نے اس وقت ترقی نہیں کی تھی، چنانچہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اس پتھر سے سیڑھی کا کام لیا۔ بخاری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے:''عن ابن عباس رضی الله عنهما قال : فجعل ابراهیم یبنی واسماعیل یناوله الحجارة ویقولان : ﴿ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم﴾ [البقرة:۱۲۷] حتی ارتفع البناء وضعف الشیخ عن نقل الحجارة فقام علی حجر المقام فجعل اسماعیل یناوله الحجارة "۔(بخاری) ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کررہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام انہیں پتھر اٹھا کے دیتے اور دونوں یہ دعاء پڑھتے: اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے قبول فرما تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے'' یہاں تک کی جب خانہ کعبہ کی بنیادیں اور اسکی دیواریں اونچی ہوگئیں اور پیرانہ سالی کے وجہ سے پتھر کو منتقل کرنا مشکل ہوگیا تو آپ اس

(مقام ابراہیم) پتھر پر کھڑے ہوکر تعمیر کرتے جاتے اور اسماعیل علیہ السلام ان کو پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے۔(بخاری)

اسی پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پاؤں کے نشانات ہیں جو اللہ تعالی کی کھلی ہوئی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور مومنوں کے لئے ایک عبرت کا سامان۔اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:﴿فیه آیات بینات مقام ابراهیم ومن دخله کان امنا﴾[آل عمران:۹۷] ترجمہ:''اس میں کھلی ہوئی واضح نشانیاں ہیں،مقام ابراہیم ہے اس میں جو آجائے وہ امن والا ہوجاتا ہے''۔اور تعمیر کعبہ اللہ تعالی کے پسندیدہ اور محبوب ترین اعمال میں سے ہے،مجاہد بن جبیر مکی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں جس کو امام طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے:کہ پتھر پر آپ کے قدم کا نشان ایک کھلی ہوئی نشانی ہے،اور وہ پتھر خانہ کعبہ کے دراز ہ کے سامنے،پورب کی جانب واقع ہے۔

مقام ابراہیم کے فضائل وخصائص: مقام ابراہیم جنت کے یاقوت (مشہور قیمتی پتھر جو سرخ نیلا زرد اور سفید رنگ کا ہوتا ہے) میں سے ایک یاقوت ہے حاکم صحیح سند کے ساتھ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ'' عن عبدالله بن عمروبن العاص رضی الله تعالی عنه قال : قال :رسول الله ﷺ :الركن والمقام یاقوتتان من یواقیت الجنة طمس الله نورهما ولولاذلك لأضاء تا مابین المشرق والمغرب'' ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''رکن اور مقام (ابراہیم) جنت کے مشہور قیمتی سرخ نیلا زرد اور سفید رنگ کے پتھروں میں سے دو پتھر ہیں اللہ تعالی نے ان پتھروں کی روشنی کو بجھا دیا ہے اگر اس کو بجھایا نہ ہوتا تو مشرق ومغرب چمک اٹھتے''۔

اس کی فضیلتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ حج وعمرہ کے مشاعر میں سے ہے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:﴿واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی﴾[البقرۃ:۱۲۵] ترجمہ:''تم لوگ مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کرلو''۔

مقام ابراہیم کی خصوصیتوں سے میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی نے اس کو مشرکین کی عبادت اور ان کی گندگیوں سے پاک وصاف رکھا جب کہ ان کا شیوہ رہا ہے کہ وہ پتھروں کی عبادت کرتے اور حد درجہ اس کی تعظیم کرتے تھے۔یہ اسکی حکمت بالغہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کسی نے اس کی عبادت نہ کی اور اس طرح اللہ تعالی اس کو بچا کے رکھا تا کہ مشرکین یہ نہ کہیں کہ اسلام نے بھی اس پتھر کی عظمت واحترام کی پاسداری کررہا ہے جس طرح جاہلیت میں اس کی تعظیم اور پوجا کی جاتی تھی۔

مقام ابرہیم کے شرعی احکام:

بیت اللہ شریف کے طواف کرنے والوں کے لئے مشروع ہے کہ وہ طواف سے فارغ ہوکر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کریں اور اس طرح کھڑیں ہوں کہ مقام ابراہیم اس کے اور خانہ کعبہ کے بیچ میں ہوجائے۔اللہ رب العالمین ارشاد فرماتا ہے:﴿واتخذو من مقام ابراهیم مصلی[البقرۃ:۱۲۵] ترجمہ:''تم لوگ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ مقرر کرلو''۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ:''قدم النبی ﷺ فطاف بالبیت سبعا وصلی خلف المقام رکعتین''ترجمہ: ''نبی ﷺ بیت اللہ کی طرف بڑھے اور اس کا سات چکر لگایا اور دو رکعت مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کی''[بخاری،مسلم]۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ آپ ﷺ کے حج کی صفت بیان کرتے ہیں کہ:ثم تقدم الی مقام ابراهیم فقرأ ﴿واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی﴾فجعل المقام بینه وبین البیت،[رواه مسلم] ترجمہ:آپ ﷺ پھر مقام ابراہیم کی

طرف بڑھے اور یہ آیت تلاوت کی ''واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى ''اور مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ کے بیچ میں رکھا۔

اسی طرح یہ بھی مشروع ہے کہ دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ساتھ پہلی رکعت میں 'سورہ کافرون' اور دوسری میں 'سورہ اخلاص' پڑھے جیسا کہ حدیث جابر سے پتہ چلتا ہے جس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے: '' أنه ﷺ يقرأ في الركعتين ﴿قل هو الله احد﴾ و ﴿قل يا أيها الكافرون﴾ ترجمہ: ''کہ آپ ﷺ ان دو رکعتوں میں 'قل ھو اللہ أحد' اور 'قل یا أیہا الکافرون' کی تلاوت فرمایا کرتے تھے''۔ بہترے ایسی سنتیں ہیں جس سے انسان غافل ہوجاتا ہے اور اس کا اہتمام نہیں کرتا ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب طواف سے فارغ ہوتا ہے تو اس وقت دو رکعت ادا کرنے سے پہلے ﴿واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى﴾ نہیں پڑھتا جب کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ: ''آپ ﷺ جب طواف سے فارغ ہو چکے ہوتے اور نماز کی ادائیگی کیلئے مقام کی طرف بڑھتے تو مذکورہ آیت کی تلاوت فرماتے''۔

دونوں رکعتیں اگر میسر ہوں تو مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرے ورنہ مسجد میں کسی بھی جگہ پڑھ لے نیز یہ نماز سنت مؤکدہ ہے دن ورات میں جس وقت بھی طواف سے آدمی فارغ ہو اس وقت پڑھے جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے: ''عن جبير بن مطعم رضى الله عنه قال :قال رسول الله ﷺ:يابنى عبد مناف لاتمنعوا أحدا طاف بالبيت وصلى أية ساعة من ليل او نهار'' ترجمہ: ''حضرت جبیر بن مطعم بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بنی عبد مناف تم لوگ بیت اللہ شریف کے طواف کرنے والوں میں سے کسی کو نماز سے نہ روکو خواہ وہ دن ورات میں کسی بھی وقت نماز پڑھیں''۔ (مسند أحمد، أبوداؤد، ترمذی)۔

مقام ابراہیم کے تعلق سے برتی جانے والی چند غلطیاں:

☆ حجاج ومعتمرین کی ایک بڑی جماعت مقام ابراہیم کو چومتی اور چاٹتی ہے اور اس کو بوسہ دینے کیلئے دھکا مکی کرتی ہے اور اسکا دیدار کئے بغیر حج وعمرہ کو ناقص تصور کرتی ہے اور وہ یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ وہ نفع ونقصان کا مالک ہے جب کہ یہ ساری چیزیں بدعت اور شرک کے ضمن سے ہیں، اور نبی ﷺ نے ان اس قسم کے سارے اعمال سے منع فرمایا ہے۔

☆ اسی طرح دو رکعت نماز کے بعد دعاء کے لئے مقام ابراہیم پر بھیڑ لگاتے ہیں خواص طور پر حج کے ایام میں جس وقت مطاف میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی اور لوگ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تکلیف پہونچاتے ہیں جبکہ مقام پر دعاء کا ثبوت نہیں ہے۔

☆ اسی طرح بہت سارے بھائی مقام ابراہیم کے پیچھے نماز ادا کرنے کو اسکا استقبال تصور کرتے ہیں اور خانہ کعبہ کے علاوہ اس کا استقبال کرتے ہیں جو سراسر ناجائز اور توحید کے منافی ہے۔

☆ ایسے ہی دونوں رکعتوں کو فرض سمجھتے ہیں اور جگہ نہ ہونے کے باوجود وہاں نماز ادا کرنے کے لئے ڈٹے رہتے ہیں جبکہ ان کا یہ فرضیت کا اعتقاد رکھنا غلط ہے بلکہ یہ رکعتیں خصوصا بھیڑ کے دنوں میں مسجد کے کسی بھی حصہ میں پڑھ لی جائے تو کافی ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی سے ثابت ہے کہ: ''آپ نے یہ دو رکعتیں 'مقام ذی طوی' پر ادا کیں''۔ (بخاری)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نبی ﷺ کی سنت پر پورے طور سے عمل کرنے کی توفیق بخشے اور بدعتوں سے محفوظ رکھے، اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ (آمین) ☆☆

فتنے اوران سے بچنے کے طریقے

حماد عبدالغفار/علیگڑھ

نبی ﷺ نے امت مسلمہ سے واضح طور پر فرمادیا کہ فتنوں کا ظہور ہوگا، یہ فتنے بڑے تیز وتند اور دین وایمان کو بہالے جانے والے ہوں گے۔

ارشادفرمایا: "إني لأرى الفتن تقع خلال بيوتكم كوقع القطر"۔ (رواہ البخاری، کتاب الفتن)

میں تمہارے گھروں میں فتنے بارش کے قطروں کی طرح گرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت معاویہ ؓ کی حدیث ہے: "لم يبق من الدنيا إلا بلاء وفتنة" (باب شدۃ الزمان)

دنیا میں صرف مصیبتیں اور فتنے ہی بچے ہیں۔

نبی ﷺ کا ارشاد برحق ہے، ہم اپنے چاروں طرف بکھرے فتنوں کو دیکھتے محسوس کرتے ہیں، لیکن اندھے بہرے بنے رہتے ہیں۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں اگر ہم فتنوں کا شمار کریں تو بڑی طویل فہرست بن جائے گی، صرف چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا، صاحب بصیرت حضرات کتب احادیث کا مطالعہ کرکے مزید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

"فتنة الرجل في أهله وماله ونفسه وولده وجاره يكفرها الصيام والصلاة والصدقة والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر" (رواہ مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ)

انسان جب خاندانی اعتبار سے قوی ہوتا ہے، مال وزر کی فراوانی رہتی ہے تو بجائے یہ کہ اللہ کے حضور یکسوئی سے عبادت وریاضت کرے اوروں پر ظلم کرنے لگتا ہے اور چونکہ پڑوسی سب سے قریب ہوتے ہیں تو سب سے پہلے نشانہ بھی وہی بنتے ہیں، اللہ تعالی کی محبت پر وہ اہل وعیال کی محبت کو مقدم رکھنے لگتا ہے، چنانچہ وہ دین سے دور ہوجاتا ہے، یہی فتنہ ہے یعنی ہر وہ برائی جو انسان کے دین وایمان، اس کی تہذیب وتمدن کو فنا کردے۔

نبی ﷺ نے اس فتنے کے علاج میں چار چیزیں بیان فرمائیں، جو بڑی جامعیت رکھتی ہیں، ان چاروں پر عمل کرکے انسان من جملہ نقائص وبرائیوں سے پاک ہوکر صاحب ایمان ہوسکتا ہے۔

طوالت کے خوف سے ان چاروں کی تفصیل ترک کی جارہی ہے، صاف بات ہے بدنی ومالی عبادتیں انسان کو نرم دل بناتی ہیں، غرور وگھمنڈ ختم کرکے اسے انسانیت سکھاتی ہیں، روزہ غریبوں کو بھوک کا احساس دلاتا ہے، انسان کو مالی عبادت مثلا صدقہ وخیرات وغیرہ پر آمادہ ہوتا ہے، یہ غریبوں کے جینے کا سامان بن کر انہیں بے راہ روی وغلط کاری سے بچاتی ہیں، اس

طرح سے معاشرہ پاک ہوکر اچھائیوں کا خوگر ہوجاتا ہے،اور فتنے رخ پھیر لیتے ہیں۔

آدمی جب عبادتوں کا عادی ہوجاتا ہے تو اسے برائیوں سے نفرت ہوجاتی ہے، وہ بھلائیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔

جب اس طرح کے صالح افراد معاشرہ میں ہوں تو پھر وہاں فتنوں کا کیا کام۔

اسی سلسلے میں خواتین بھی اپنا تعاون دیں گی، بلکہ یہ ان کی ذمہ داری اور فریضہ ہے، زیادہ نہیں تو بچوں کی ہی صحیح تربیت کرکے ان میں دینی جذبہ بیدار کریں۔

تاریخ کے صفحات پلٹیں تو اس سلسلے میں صحابیات رضوان اللہ علیہن اور دیگر خواتین کا بھرپور کردار سامنے آئے گا۔

وہ خطرناک فتنے جن میں مبتلا ہونے کا ہمہ وقت اندیشہ لگا رہتا ہے،ان میں چند کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

لباس کا فتنہ:

امام مسلمؒ نے صفۃ المنافقین کے تحت حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث نقل کی ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

''دو قسم کے جہنمیوں کو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا، ایک تو وہ لوگ جن کے پاس بیل کی دم کی طرح کوڑے ہوں گے جن سے وہ اپنی رعایا کو ماریں گے، دوسری وہ عورتیں لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں، مردوں کو بہکاتی اور خود بھی بہکتی ہیں، ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح جھکے ہوں گے، ایسی عورتیں نہ جنت میں جائیں گی، نہ جنت کی خوشبو سونگھ سکیں گی، حالانکہ خوشبو طویل مسافت سے آتی ہوگی۔ فی زمانا لباس کا فتنہ بڑی سنگین صورت اختیار کرگیا ہے، مسلم خواتین بھی کہاں پیچھے رہنے والی ہیں،، انہوں نے بھی یہ فتنہ قبول کرلیا ہے، یہ فتنہ مختلف جرائم مثلاً زنا، چھیڑ چھاڑ، اغوا وغیرہ وغیرہ کی جڑ ہے۔

طبی نقطۂ نظر سے بھی یہ ضرر رساں ہے:

اطباء نے لکھا ہے کہ تنگ لباس Cell، Tissue (خلیہ وانسجہ) کو نقصان پہنچاتا ہے، یہ انسانی بدن کی وہ اکائیاں ہیں جن کے بگڑ جانے سے بدن صحیح سالم رہ ہی نہیں سکتا۔

اس طرح کے لباس Sex Organs (تولیدی اعضاء) کو بگاڑ کر عورت کو بانجھ تک بنا دیتے ہیں، ولادت غیر فطری ہوجاتی ہے، دوران خون بھی غیر معتدل رہتا ہے۔ (زینۃ المراۃ بین الطب.....)

اس طرح کے لباس میں نماز بھی قبول نہیں ہوتی، دینی ودنیاوی ہر طرح کا نقصان رہتا ہے۔

خدارا اس سے دور رہئے، اپنی عورتوں کو سمجھائیں کم از کم بدن کی صحت وحفاظت کے لیے ہی اس فتنہ سے باز رہیں!

اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿يا بني آدم قد أنزلنا عليكم لباسا يواري سوء اتكم وريشا ولباس التقوى ذلك خير﴾۔ (الاعراف:۲۶)

آیت پر غور کریں عورتوں کے لیے آرائش کا جواز ہے، اچھے لباس کا وہ انتخاب کرسکتی ہیں، لیکن ایسا لباس جو مکمل ساتر

ہو، ہاں سادگی خلوص کا موجب بنتا ہے، اصل مقصد تو آخرت ہے، لہذا متقی بن کے زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کریں، ہمارا اصل لباس تقوی ہو، احکام شرعیہ بجالا کر اس لباس کو جتنا ہو سکے مزین کریں اور فتنوں سے دور رہیں۔

شرک وبدعات کا فتنہ:

عقیدے کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ لوگ توحید کو افتراق امت کا سبب ماننے لگے ہیں، جہاں توحید نہ ہوگا وہاں شرک ہی آئے گا، بدعتوں کی بھرمار رہے گی، من گھڑت چیزوں کو افضل اعمال میں شمار کیا جائے گا، جہاں دیکھو نئی باتیں یہ عظیم فتنہ ہے، اس میں واقع ہونے والا سب کچھ ہار جاتا ہے، اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ ہم کتاب وسنت کو پھر سے تھام لیں، "تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما، كتاب الله وسنة رسوله" (موطأ امام مالک)

گمراہ کن لٹریچر، سطحی کتابوں پر توجہ نہ دے کر معتدل علماء کی کتابیں پڑھیں، عقیدے پر اردو میں بھی وافی مواد موجود ہے، ان کا سہارا لیں، اچھے علماء سے رجوع کریں ورنہ سب کچھ چلا جائے گا۔

عورتوں کا تجارت میں حصہ لینا، فی الواقع یہ بہت عام چیز ہے، مسند احمد میں مروی ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

''قیامت سے پہلے صرف جان پہچان والوں کو سلام کیا جائے گا، تجارت کو اتنا فروغ ملے گا کہ بیوی شوہر کی معاون ومددگار ہوگی، قطع رحمی عام ہو جائے گی''۔

صرف عورتوں کا تجارت میں حصہ لینا ہی فتنہ نہیں، اس کے پیچھے بھی فتنے ہیں، بچوں کی طرف سے غفلت پیدا ہوگی، ان کی صحیح دینی تربیت نہ ہو سکے گی، وہ دنیا دیکھتے دیکھتے جوان ہو کر اسی میں کھو جائے گا۔

مرد خود محنت کریں، اللہ تعالی نے جتنی روزی متعین کی ہوگی ملے گی، بلاسبب عورتوں کو نہ گھسیٹیں۔

حرام کمائی کا فتنہ:

نبی ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب آدمی پرواہ ہی نہ کرے گا کہ حلال طریقے سے مال کمایا ہے یا حرام طریقہ سے''۔ (بخاری عن ابی ھریرۃ، کتاب البیوع)

بیع وشراء کے مسائل سے ناواقفیت، دوسروں سے سبقت لے جانے کی ہوس نے انسان کو دین سے بے گانہ کر دیا ہے، اس نے حلال وحرام کی تمیز کھو دی ہے، اتنا شعور نہیں کہ حرام مال کا نہ تو صدقہ قبول ہوگا، نہ ہی عبادت، اب اس حرام مال کا کیا فائدہ، جہنم کا ایندھن الگ سے جھوٹ، فریب کاری، غناء وموسیقی بغاوت، فقدان عمل، ضیاع امانت آج سارے فتنے تو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں اور ہم مسلمان ہیں کہ اپنے حال پہ مست۔

اپنا وطیرہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، خلوص کے ساتھ دین کی طرف راغب ہوں، یہ فکر چھوڑیں کہ دین کے ساتھ دنیا ہم پر تنگ ہو جائے گی، کبھی نہیں! عزت وقوت مومنین کے لیے ہے، اللہ تعالی متقیوں کا حامی وناصر ہے، یہ سارے فتنے عبادات وریاضات سے ہی دور ہوں گے اور کوئی راستہ نہیں!

☆☆☆

بیت المال: ضرورت واہمیت

مستفیض الرحمٰن محمد ریحان
فضیلت سال آخر، جامعہ سلفیہ، بنارس

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو فطری تقاضوں کی پوری رعایت کرتا ہے، اس کے اندر وہ تعلیمات ہیں جن کے اپنانے سے خوشحالی اور فراخی عام ہو جاتی ہے اور اس کے ماننے والے نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے سخت دشمن بھی ہیں جو اس کی روح پرور تعلیمات سے متاثر ہیں، بسا اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی توجیہات وارشادات اور اس کے نظام وقانون اس طرح غیر مسلموں کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے، چونکہ اسلام میں مساوات ہے، اسے اپنانے والوں کو ساری زندگی سر اٹھا کر جینے کی سند مل جاتی ہے، جہاں نفرت وحقارت کی تمام دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں، وہیں اخوت ومحبت اور ہمدردی وغمگساری کی مضبوط بنیاد پڑ جاتی ہے، اس لیے اس کی تعلیمات میں جادو کا سا اثر ہے، گرچہ لوگ غیر مسلم ہی رہتے ہیں، مگر اس کی تعلیمات کی تعریف وستائش میں پیچھے نہیں رہتے اور ان تعلیمات کے فوائد کی برکت ہی ہے کہ اسلام غیروں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے اور یہ اسلام اس طرح ان کے اندر راسخ ہو جاتا ہے کہ اس کے رنگ میں رنگ جانے کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

خدمت خلق کے بارے میں اسلامی تعلیمات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، زکوۃ اور اس کی تحصیل ومصارف کے اعلی انتظامات بھی غریب ولاچار مسلمانوں کے لیے ایک اہم قدم ہے، زکوۃ کی ادائیگی کا حکم، اس کا نصاب، اس کا طریقہ کتاب وسنت میں بحسن وخوبی مذکور ہے، جبکہ اس کا رکھ رکھاؤ، اس کا انتظام وغیرہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی سیرتوں سے پتہ چلتا ہے۔

صدقہ وزکوۃ ایک مستطیع مسلمان پر واجب وضروری ہے، کتاب وسنت میں اس کے ادلہ کی کثرت ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالی نے زکوۃ کو کیوں فرض کیا؟ اس میں کون کون سے مصالح کارفرما ہیں؟ اس کے فقدان سے کون کون سی برائیاں جڑ پکڑتی ہیں اور کیا کیا خرابیاں لازم آتی ہیں؟ یہ سب ایسے کچھ سوالات ہیں جن کے صحیح جوابات سے ہم اسی وقت واقف ہو سکتے ہیں جب ہم بیت المال کے وجود اور عدم وجود کے فوائد ونقصانات سے واقف ہوں گے۔

دراصل بیت المال کے نام سے ہمارے کان نا آشنا نہیں ہیں، لیکن اس کے نہ قائم ہونے کی وجہ سے اس کے فیوض وبرکات سے ہم محروم ہیں، دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو ہیں، ایک اچھا دوسرا برا، انسان اپنی مختلف النوع فکر سے ایک ہی چیز کے دونوں پہلوؤں کو پرکھ سکتا ہے، اسی طرح بیت المال کا ایک مفید پہلو ہے جب تک ہم اس کے اس مفید پہلو کے بارے میں پوری طرح واقف نہ ہوں گے ہمارے اندر اس کے قیام کے تئیں نشاط پیدا نہیں ہوگا، وہ خوبیاں جنہیں اپنا کر ہمارے آباء سرخرو ہوئے، ہمارے معاشرے میں اخوت ومؤدت عام رہی، ہم حقد وحسد سے کوسوں دور رہے، خوشحالی کی فضا میں سانس لیتے رہے اور عبادت وریاضت کے اعلی منصب پر فائز رہے، وہ ہم نے ترک کر دیئے، ان کی طرف ہم نے چنداں توجہ نہ کی، ہم نے ہمیشہ ملت اور قوم کے دکھ درد کو پرائے لوگوں کا دکھ درد سمجھا۔

آج جبکہ پوری دنیا ترقی کی معراج پر کھڑی مسرت کے نعرے لگا رہی ہے، چند شاذ لوگوں کو چھوڑ کر کسی کو غرباء اور فقراء کے

احوال زار پر کان دھرنے کی فرصت نہیں، بیت المال کا نظام ایک ایسا نظام ہے جو ہر انسان کے دکھ درد کا ساتھی ہے، غریبوں اور ناداروں کے تکالیف کا مداوا ہے، اگر اس بیت المال کا قیام حقیقی طور پر خصوصا مسلم معاشروں میں نہیں ہوتا ہے تو مسلم قوم کی محتاجگی وفقر کا جو حال ابھی اس وقت ہے وہ اگلے کچھ سالوں میں اور عبرتناک بن جائے گا، آج تمام اقوام عالم میں مسلم قوم ہی ایک ایسی قوم ہے جو اقتصادیات میں سب سے پھسڈی ہے، میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ اسلام کے علمبرداروں میں کوئی غنی اور سرمایہ دار نہیں ہے، ضرور ہے، مگر کسی قوم کی حالت کی پرکھ اس کی اجتماعی صورت اور حالت کا پتہ لگا کر ہی کی جاتی ہے اور اجتماعی طور پر ہم دوسرے اقوام سے پیچھے ہی ہیں کیونکہ امداد وتعاون کا وہ طریقہ اور جذبہ جو ہماری فطرت میں ودویعت تھے، بالجبر ہم اس سے دستبردار ہو گئے اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں نے ہماری وہ تمام تعلیمات، ہمارے وہ تمام طریقے جو ہمیں نبی ﷺ دے کر گئے تھے، وہ گر جو ہمیں صحابہ کرام اور تابعین عظام سکھلا گئے تھے، ان سب کو اپنا لیا اور انہیں تعلیمات ومناہج کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے اپنے اندر باہم امداد وتعاون کی فضا قائم کی خواہ وہ بیت المال کے توسط سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے مگر وہ اپنی سوچ اور اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

بیت المال کیا ہے؟ یہ ایک فنڈ ہی تو ہے، یہ اسی قسم کا ایک فنڈ ہے جس کا تصور جدید ذہن کی جدید نسل کے دماغ میں ہے، لیکن بیت المال اور فنڈ دونوں ہیئت میں مؤتلف ہونے کے ساتھ ساتھ طریقۂ استخدام میں دونوں میں قدرے فرق ہے کیونکہ فنڈ (Fund) میں ہر ایک کی Membership ہوتی ہے اور اس فنڈ کی ترویج وفروغ کے لیے یہی ممبر حضرات اسے اپنا سمجھ کر کوشاں رہتے ہیں، اس کے برخلاف بیت المال ایک ایسا فنڈ ہے جس کا قاعدہ ہے: "تؤخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم" اور یہ قاعدہ ربانی ہے، اور اغنیاء کی Membership یہ کوئی Optional اور اختیاری چیز نہیں، یہ واجبی چیز ہے، کیونکہ بیت المال کا تعلق زکاۃ جیسے اسلام کے اہم رکن سے ہے یا صدقہ جیسے نیکیوں کے چشمے سے ہے، یہ بیت المال ایک ایسا باغ ہے جہاں برکات وخیرات کی کلیاں کھلتی ہیں، جہاں سے دکھ درد رخصت ہو جاتا ہے، اور اس کی جگہ خوشحالی اور آسودگی آ کر اپنی مہک سے اس باغ کو معطر کر دیتی ہے اور اسلامی معاشرہ اس کی عطر بیزی سے خوشنما ہوا ٹھتا ہے۔

بیت المال کے فیوض وبرکات کا اندازہ ہم فاروق اعظم کے سبق آموز قصے اور حالات سے کر سکتے ہیں، فاروق اعظم جیسی جلیل القدر شخصیت کے مالک اسی بیت المال کی برکت سے ایک بے یار ومددگار عورت کی آہ سن کر اس کی مدد کو دوڑ جاتے ہیں، انہیں تو بیت المال کی حفاظت وصیانت اور اس کے حقوق کی پاسداری کی اتنی فکر تھی کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کو قیصر کی جانب سے ایک ہار تحفے میں ملا جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے وہ ہار اپنی اہلیہ سے لے کر بیت المال میں رکھوا دیا اور فرمایا کہ ''امت بہ نسبت تمہارے اس ہار کی زیادہ حقدار ہے'' مگر ہم نے عمر فاروق کے بنائے نظام کو بھلا دیا، اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیز کو بیت المال کی ذمہ داری کا اس قدر پاس تھا اور انہیں اس کے تحفظ کا اس قدر خیال تھا کہ ایک ہی مجلس میں جب وہ حکومت کا کام کرتے تو بیت المال کے تیل سے روشن چراغ کی خدمت لیتے اور جب اسی درمیان اپنی کوئی غرض ہوتی یا خود کا کوئی مسئلہ سلجھانا ہوتا تو وہ چراغ جو بیت المال کے تیل سے روشن تھا بجھا دیتے اور فرماتے کہ ''جب بروز قیامت اللہ تعالی مجھ سے اتنے وقفے کے بارے میں سوال کرے گا تو میں کیا جواب دوں گا''؟

تو اب آپ سوچئے کہ ایک طرف ان بزرگان دین اور خلفائے وقت کا یہ حال کہ بیت المال جو مسلم معاشرے کو تقویت بخشتا ہے کی محافظت میں اس قدر سرگرم کہ اس کی بنیادیں کسی بھی طریقے سے کمزور نہ پڑیں، اس کے لیے وہ ہمہ وقت مستعد رہتے تو دوسری طرف اس میدان میں ہماری کاہلی وکسل مندی کی ناگفتہ بہ صورت حال، بیت المال کی محافظت اور اس کے صحیح استعمال کے فیوض وبرکات کا اندازہ لگائیے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں لوگ اپنے اپنے صدقات لے کر سڑکوں میں پھرتے تھے کہ کوئی صدقہ کا مستحق مل جائے مگر خوشحالی وآسودگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی مستحق شخص نہ ملتا تھا، مگر ہم نے ان حضرات کے بنائے نظام کو بھلا دیا، ان کے ایثار کی قدر نہ کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے طریقے کو چھوڑ دیا، صدیق اکبر کے جلال کو پس پشت ڈال دیا اور اتنی کوتاہیوں کے باوجود بھی ہم خوشحالی وآسودگی کے طلب گار ہیں؟؟

هذا محال في القياس بديع۔

بیت المال کے تعلق سے یہ بات کہنی ہے کہ ایسا نہیں کہ اس کا تصور فی زمانا نہیں ہے، ایسا نہیں، بلکہ اس کا تصور آج بھی ہے اور ہم چونکہ ہندوستان جیسے جمہوری اور غیر مسلم اکثریت ومسلم اقلیت ملک میں رہتے ہیں جہاں اسلامی قوانین کا نفاذ ہم اسطرح نہیں کر سکتے جس طرح کسی مسلم اکثریت والے ملک میں کر سکتے ہیں، اس لیے ہمارے اس ملک میں بعض جگہوں پر اس کا رواج بھی ہے مگر وہ وقتی ہوتا ہے، مثلا رمضان کا مہینہ لوگوں نے اس کے لیے خاص کر رکھا ہے، اسی میں وہ کچھ رقم جمع کرتے ہیں اور بیت المال کی رقم کا نام دیتے ہیں، مگر شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ بیت المال Temparory Fund کا نام نہیں بلکہ یہ ایک Permanent Treasury ہے یعنی مستقل خزانہ ہے جو نادار وحاجت مند مسلمانوں کی خبر گیری کے لیے بوقت ضرورت استعمال ہوتا ہے، یہ رواج خصوصا ہمارے ملک کے مہاراشٹر ومدھیہ پردیش وغیرہ صوبوں میں ہے، البتہ اسی بیت المال ملتی جلتی ایک شکل ریاست ''کیرالہ'' میں نظر آئی، وہ لوگ اسے گرچہ بیت المال کا نام نہیں دیتے مگر اس کا کام، انتظام وانصرام وغیرہ بیت المال کے مشابہ ہے، مثلا "KNM" کے نام سے ۱۲ رمہینے ان کے فنڈ کا بکس موجود رہتا ہے اور صاحب سرمایہ لوگ اس میں حسب استطاعت رقم ڈالتے جاتے ہیں، ہر مہینے کے آخر میں اسے کھولا جاتا ہے اور اس سے برآمد رقم سے حاجت مندوں کی مدد کی جاتی ہے، گرچہ اس میں اخذ کا طریقہ بدلا ہوا ہے، تاہم عطا کا طریقہ بہت حد تک عہد نبوی کے بیت المال کے مشابہ ہے، لیکن خواہ کچھ بھی ہو ایک اسلامی تعلیم کے عدم وجود سے منصۂ وجود میں رہنا بہر حال ایک امید افزا قدم ہے، فکر تو ان لوگوں کو ہونی چاہئے جو عام مسلمان اور مستحقین کے لیے اس بیت المال کے ذریعہ سہولیات میسر کرانے پر قادر نہیں ہیں، شمالی ومشرقی ہند اس معاملے میں کافی پھسڈی ہے، مثلا اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال وغیرہ، اس لیے کہ زکاۃ گرچہ ان ریاستوں کے سرمایہ داران بھی نکالتے ہیں مگر وہ سلیقہ وطریقہ جو نبی ﷺ نے ہمیں سکھلایا تھا جس کی صحابہ وسلف صالحین نے تعلیم دی تھی، مفقود ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ان ریاستوں کے مسلمان جس قدر محتاج وتلاش ہیں، دوسری ریاستوں کے مسلمان نہیں، اس تنگ دستی اور کسمپرسی کا واحد علاج اب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بیت المال قائم کیا جائے اور اس سے ضرورت مند مسلمانوں کی صحیح خبر گیری کی جائے، یہ ہمارا ملی فریضہ ہے۔

بیت المال کے قیام کی اہمیت کا اندازہ لگائیے کہ اس سے قرآن وسنت پر عمل بھی ہو جاتا ہے، وہ اس طریقے کہ جب بیت المال کا وجود نہ ہوگا تو ضرورت مند حضرات سرمایہ داروں کے یہاں، ان کے دروازوں پر جائیں گے اور ہاتھ پھیلائیں گے اور اس

صورت سے مستحق شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص نے یہ رقم دی ہے، لیکن اگر بیت المال قائم ہو جائے تو اس میں بغیر ناموں کے افشاء کے صدقات وخیرات کی رقم کی وصولی ہوگی اور اخفاء یہ ابداء سے بہتر ہے، کیونکہ اللہ رب العالمین نے فرمایا:

" ان تبدوا الصدقات فنعما هي وان تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم" (البقرۃ:۲۷۱)

یعنی اگر تم ظاہرا صدقہ کرتے ہو تو ٹھیک ہی ہے لیکن اگر اس صدقہ کو چھپا کر دیتے ہو اور فقراء ومساکین پر پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

اسی طرح حدیث ہے: "سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل الا ظله ..... وفيه ..... ورجل تصدق بصدقة فأخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه"۔ (متفق علیہ)

یعنی اللہ رب العالمین کے عرش کے سایے میں قیامت کے دن وہ شخص بھی جگہ پائے گا جس نے کوئی صدقہ کیا اور چھپا کر پوشیدہ طور پر کیا، یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہ جان سکا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اسی طرح محض بیت المال کے قیام سے اتنی صریح آیت اور اتنی واضح حدیث پر عمل ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ بھی بیت المال کے قیام پر اور اس کی اہمیت پر استدلال کی جانے والی بہت سی احادیث ہیں مگر یہاں ان تمام کے ذکر کا محل نہیں، زیرک وفہیم حضرات ایک ہی حدیث کے ذکر اور استدلال سے اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بیت المال قائم کرنا کیوں ضروری ہے، یہ بتانے کے لیے میں آپ کو ایک نہایت ہی اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ مدارس اسلامیہ جو اسلامی تعلیمات کے تحفظ کے مضبوط قلعے ہیں، کا دار ومدار صدقات وخیرات اور زکاۃ کی رقم پر ہے، سوائے چند مخلصین ملت کے عام مستطیع مسلمان حضرات رجحان یہی ہے کہ جب تک ان کے پاس علماء حضرات مدارس کے نمائندے بن کر نہ آئیں وہ اپنے اوپر عائد حقوق ان کے مستحقین کے یہاں پہنچانے میں کافی کوتاہ ہیں، اور بسا اوقات اپنے حقوق ان سے لیتے وقت بھی انہیں یعنی علماء حضرات کو طعن وتشنیع سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں، اب اس صورت حال میں بیت المال اگر قائم ہو اور اس میں ایک ملک کے تمام سرمایہ داران کی زکاۃ جمع ہو، نیز ان جمع شدہ فنڈ میں سے ہر ایک کے حصص مقرر کر دیئے جائیں، مدارس کے الگ، غرباء کے الگ، مسافروں کے لیے الگ، عاملین کے لئے الگ وغیرہ اور کیا ہی اچھا ہوگا اگر عاملین بیت المال علوم شرعیہ کی قدر کرتے ہوئے مدارس کی رقم ان کے یہاں کسی بھی وسیلے سے پہنچا دیں! تو اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنے فوائد سے بھرا قدم ہوگا، اس طریقے کے رواج پا جانے کے بعد اب علماء کو در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی اور ذلت آمیز کلمات نہیں سننے پڑیں گے، علم دین اور علماء کی ایک شان ہوگی اور علماء کو جہال وعام لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، علاوہ ازیں خوشحالی عام ہوگی، فقر ومحتاجگی سے دامن چھڑانے کا موقع ملے گا، اخوت وبھائی چارگی کی فضا قائم ہوگی، محبت ومودت کا ماحول بنے گا اور رعیل اول کی اقتداء کی خوشگوار ہوا کے جھونکے ہمیں معطر کرتے رہیں گے۔

ہم مولائے کریم سے دست بدعا ہیں کہ ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر ممکن مدد کرنے کی توفیق عطا فرما، حدیث شریف "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين ..... الخ" (متفق علیہ) پر عامل بنائے، تعاون علی البر والتقوی کی عملی تطبیق کی توفیق بخشے اور ہم تمام مسلمانوں کو دنیا وآخرت دونوں جگہ سرخروئی عطا فرمائے، آمین۔ ☆☆

سال نو کی مناسبت سے اساتذہ وذمہ داران کا
طلباء سے خطاب

۱۳؍جولائی بروز بدھ صبح ساڑھے گیارہ بجے قاعۃ المحاضرات جامعہ سلفیہ بنارس میں ایک تقریب زیر صدارت ڈاکٹر جاوید اعظم عبدالعظیم صدر مجلس منتظمہ جامعہ سلفیہ منعقد کی گئی جس میں طلباء جامعہ سلفیہ خصوصا نو وارد طلباء کو جامعہ سلفیہ میں خوش آمدید کہا گیا اور جامعہ کے قوانین وضوابط کی پابندی کرنے کی نصیحت پرزور انداز میں کی گئی۔

پروگرام کی نظامت مولانا عبدالوہاب حجازی صاحب نے فرمائی، آغاز محمد مرتضی ف ۳؍ کی تلاوت مبارکہ سے ہوا، اس کے بعد مولانا محمد مستقیم سلفی صاحب نے حضرت موسی وخضر کے متعلق آیات کریمہ کی تلاوت کر کے شرائط وضوابط کی اہمیت اور فوائد پر روشنی ڈالی اور طلباء سے بلا کسی قیل وقال اور حیلہ وحجت کے طیب نفس کے ساتھ ان کی پابندی کرنے کی اپیل کی۔

بعدہ شیخ اسعد اعظمی صاحب نے حاضرین وطلباء کو خطاب فرمایا جس میں آپ نے تربیت کو تعلیم کا ایک جزء قرار دیا نیز آپ نے طلباء کو اپنی اور اپنے وقت کی قدر کرنے کی نصیحت کی اور مستقبل میں مدارس عربیہ کے طلباء کے لیے جو زریں مواقع ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طلباء کو اپنے اندر ان سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت پیدا کرنے کی تلقین کی۔

اس کے بعد طلباء کو بھی اس پروگرام میں اپنی بات رکھنے کا موقع دیا گیا، اس کے لیے ایک طالب علم محمد عمر محمد یوسف ف ۱ اسٹیج پر آئے اور یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کا ماحول ایسا بنے کہ ہر طالب علم اپنی باتیں اور مسائل اساتذہ، شیخ الجامعہ اور ناظم اعلی کے سامنے بلا کسی دشواری کے پیش کر سکے، بعدہ شیخ اسعد اعظمی اور شیخ الجامعۃ السلفیۃ مولانا نعیم الدین صاحب مدنی نے طالب علم کی اس تجویز پر تمام اساتذہ کی طرف سے اتفاق ظاہر کیا اور کہا کہ ہم لوگوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ طلباء ہم سے قریب رہیں اور اپنی باتیں بلا تکلف بیان کریں۔

بعدہ ناظم اعلی جامعہ سلفیہ مولانا عبداللہ سعود سلفی صاحب نے خطاب فرمایا، جس میں آپ نے تعلیم کی اہمیت ونظام کی اہمیت، نظام کی پابندی کے فوائد پر روشنی ڈالی اور اخیر میں "الدين النصيحة ....." اس حدیث کو پڑھ کر یہ بتلایا کہ جو بھی نظام اس جامعہ کے اندر بنایا گیا ہے اس سے اس ادارہ سے جڑے ہوئے افراد کی خیر اور بھلائی ہی مقصود ہے۔

اس کے بعد محترم ارشد وزیری صاحب نائب ناظم جامعہ سلفیہ نے بھی طلباء کو خطاب کیا اور اسی بات کی نصیحت کی کہ اگر کوئی استاذ آپ سے تادیب کے طور کوئی بات کہتا ہے تو اس میں یقیناً آپ سے محبت اور ہمدردی کا ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اسے آپ سے کوئی عداوت یا دشمنی نہیں ہے، نیز آپ نے طالب علموں کو اچھے انسان بننے کی نصیحت کی اور بتلایا کہ اس کے لیے آپ کو اچھا مسلمان بننا ہوگا۔

پروگرام کے اخیر میں صدر باوقار ڈاکٹر جاوید اعظم صاحب نے اپنا ناصحانہ صدارتی خطاب پیش کیا جس میں آپ نے قوانین وضوابط کے بعض ضروری بنود کی وضاحت فرمائی، نیز آپ نے جامعہ کی دیگر مدارس اسلامیہ کے درمیان جو خصوصیتیں ہیں اور اس جامعہ میں جو سہولیات فراہم ہیں ان کا ذکر کیا، طلباء کے لیے کلاس میں ۸۰ فیصد حاضری، اساتذہ کا احترام، دروس کی اہمیت سمجھنا اور دلچسپی سے پڑھنا، نماز کی پابندی کرنا، موبائل کے استعمال پر پابندی، لائبریری سے استفادہ کرنا، دین کے طالب علموں کے اوصاف کو اختیار کرنا، ان نکات پر آپ نے خاص طور پر طلباء کو توجہ دینے اور پابندی کرنے پر زور دیا۔

اس کے بعد پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا گیا اور شہر سے تشریف لائے جامعہ کے ممبران ومہمانان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

☆☆ (عبدالمتین مدنی)

باب الفتاوی

سوال: وتر میں قنوت پڑھنے کا صحیح محل کیا ہے؟ ایا رکوع سے پہلے پڑھنا زیادہ افضل ہے یا رکوع کے بعد پڑھنا زیادہ صحیح ہے؟

الجواب بعون اللہ الوھاب وھو الموفق للصواب:

صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ رسول اکرم ﷺ کے قول وفعل اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم کے عمل سے وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے ثابت ہے، اور کم وبیش اکثر روایات رکوع سے پہلے ہی قنوت وتر پر دلالت کرتی ہیں: اس مدعا کے ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابی بن کعب ؓ سے روایت ہے:

" ان رسول الله ﷺ كان يؤتر فيقنت قبل الركوع" (ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب ما جاء فی القنوت قبل الرکوع وبعدہ ح:۱۱۸۲، نسائی ۳/۲۳۵، دار قطنی ۲/۳۱)

اسی طرح نواسۂ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "علمني رسول الله ﷺ أن أقول إذا فرغت من قراء تی في الوتر اللهم اهدني ..... " (کتاب التوحید لابن مندہ ۲/۹۱، ارواء الغلیل ۲/۱۶۶) یعنی رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ کلمات وتر میں قرأت سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کے لیے سکھائے: "اللهم اهدني ..... " یہ روایت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ وتر میں دعائے قنوت قرأت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے کرنی چاہئے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں یہ عبارت مذکور ہے کہ: " ان ابن مسعود رضي الله عنه وأصحاب رسول الله ﷺ كانوا يقنتون في الوتر قبل الركوع" (ابن ابی شیبہ ۲/۳۰۶، ارواء الغلیل ۲/۱۶۶ حضرت العلام شیخ ناصر الدین البانی ؒ نے اس حدیث کو مسلم شریف کی شرط پر صحیح کہا ہے۔

اسی طرح کے ایک استفتاء کے جواب میں شیخ الحدیث علامہ مبارکپوری ؒ فرماتے ہیں: ''نماز وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے قرأت کے بعد اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد دونوں جائز ہے، لیکن رکوع سے پہلے اولی اور زیادہ بہتر ہے، رکوع سے پہلے قنوت پڑھنے کے بارے میں متعدد روایتیں آئی ہیں اور ان میں سے بعض صحیح اور معتبر ہیں، اور رکوع کے بعد

قنوت کے بارے میں صرف ایک مرفوع روایت مستدرک حاکم ۳/۱۷۲، اور سنن کبری للبیہقی ۳/۳۹ میں مروی ہے، لیکن اس روایت میں "اذا رفعت رأسي ولم يبق إلا السجود" کے الفاظ محفوظ نہیں ہیں، اسی لیے شافعیہ نے قنوت بعد الرکوع کے ثبوت کے لیے بعض صحابہ کرام کے آثار اور قنوت نازلہ پر قیاس کا سہارا لیا ہے۔ مرعاۃ المفاتیح ۲/۲۱۳، اور فتاوی شیخ الحدیث مبارکپوری ۱/۳۴۳، باب الوتر والقنوت میں تفصیل موجود ہے۔ اہل علم ملاحظہ فرمالیں۔

حضرت عاصم الاحولؒ کہتے ہیں:

''میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا: ''رکوع سے پہلے ہے''، پھر میں نے کہا: فلاں شخص تو آپ کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ رکوع کے بعد ہے، تو حضرت انسؓ نے کہا: وہ غلط کہتا ہے، نبی کریم ﷺ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت پڑھا، یہ اس وقت ہوا جب آپ ﷺ نے ستر (۷۰) قراء صحابہ کو مشرکوں کی ایک قوم (بنی عامر) کی طرف تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا، ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان وعدہ تھا، (انہوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے ان ستر (۷۰) قراء صحابہ کرام کو شہید کر ڈالا) تو آپ ﷺ نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت پڑھا اور ان پر بددعا فرمائی۔ (صحیح البخاری، باب غزوۃ الرجیع ح: ۴۰۹۶، مسند احمد ۳/۱۶۷)

اوپر مذکور بخاری شریف کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو دعا ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی خیر خواہی، کفار ومشرکین وملحدین ومعاونین ودشمنان اسلام کے لیے بددعا کے طور پر کی جاتی ہے وہ رکوع کے بعد ہے، جسے قنوت نازلہ کہا جاتا ہے، اور جو دعاء رکوع سے پہلے مانگی جاتی ہے وہ قنوت وتر ہے۔

ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب

ابوعفان نورالہدی عین الحق سلفی مالدہی

استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

☆☆☆